زمین

خدیجہ مستور



"میری بیٹی، میری بیٹی، میری بیٹی کہاں ہے؟" بوڑھا اپنے بال نوچ کر زور زور سے چیخا اور پھر سر جھکا لیا۔ چیخنے کے بعد جیسے اسے قرار آجاتا اور پھر گھنٹوں وہ ایک ہی طرح سے سر جھکائے بیٹھا رہتا۔ اس کے پاس سے سب لوگ خاموشی سے گزر جاتے۔ کوئی اس سے نہ بولتا، کوئی اسے جواب نہ دیتا۔ شاید اسے جواب دینے کی کسی میں بھی سکت نہ تھی یا پھر سب اپنے آپ میں مگن تھے مگر ساجدہ کو ایسا محسوس ہوتا کہ بوڑھے کی ہر چیخ اس کے کلیجے سے دراتی ہوئی گزر جاتی ہے۔ اس کا جی چاہتا کہ وہ بوڑھے کے پاس جائے، اسے تسلّی دے۔ لیکن وہ اپنی جگہ سے ہل بھی نہ سکتی تھی۔ آخر وہ اس سے کیا کہے گی؟

ایک باپ جس کی بیٹی کو لوگ جبراً چھین لے گئے ہوں، وہ اس سے کن لفاظ میں ہمدردی کرے گی! صبر جیسا لفظ سن کر تو اس کے کان پک گئے تھے۔ بوڑھے سے وہ صبر کی بات نہیں کر سکتی۔

جب بھی بوڑھا چیختا تو ساجدہ الفاظ کی تلاش میں پریشان ہوتی رہتی۔ اسے کیا پتا تھا کہ جبر کا نشانہ بننے والوں کی تسلّی کے لیے آج تک الفاظ پیدا نہیں ہوئے تھے۔

وہ اپنا جی بہلانے کے لیے بوڑھے سے نظریں چُرا کر اِدھر اُدھر دیکھنے لگتی۔ عورتوں اور مردوں کے چہروں پر اسے بے سرو سامانی برستی محسوس ہوتی، حالانکہ سب نے اپنا اپنا ٹھکانہ بنا لیا تھا۔ فوجیوں کی خالی کی ہوئی لمبی لمبی بدرنگ بارکوں میں، درختوں کے سائے تلے، دریوں کی چھتوں کے نیچے، تمبوؤں کے پُراسرار اندھیروں کے اندر، زمین کے اس ٹکڑے نے سب کو پناہ دے دی تھی۔ اس نے سب کے قدموں کی تھکن اپنے سینے میں جذب کر لی تھی۔

ابّا نے بھی ایک گھنے درخت کے نیچے، موٹی چادروں کی دیواریں بنا کر اسے بٹھا دیا تھا اور اس نے سفر کی دہشت کے بعد پہلی بار سکون کی سانس لی تھی۔

والٹن کیمپ کی یہ تیسری شام تھی۔ امدادی کمیٹیاں سُورج ڈھلنے سے پہلے ہی تکبیر کے پُرجوش نعروں کے درمیان چنے کی دال اور نرم و گرم روٹیاں بانٹ گئی تھیں اور اب حُقّہ پینے والوں کی ٹولیاں، ننّھے ننّھے الاؤ جلا کر ان کے گرد بیٹھی تھیں۔ حُقّے کے ہر کش پر دھوئیں کی ننّھی سی بدلی اُٹھتی اور ہوا میں گُم ہو جاتی۔ لوگ بہت زور زور سے باتیں کر رہے تھے، وہ اپنی اپنی بپتا کے ترازو میں دُکھوں کا زیادہ سے زیادہ بوجھ بھرنے کی کوشش میں ڈنڈی مار رہے تھے۔ عورتوں کی ٹولیاں الگ بیٹھی تھیں۔ خنک ہوا میں ان کے مَیلے کچیلے آنچل پھڑپھڑا رہے تھے۔ ان کے چہروں پر گھروں کی چھت کے سائے کی محرومیت برس رہی تھی۔ لڑکیاں اب تک دہشت زدہ سی تھیں، پھر بھی اپنے آس پاس سے گزرنے والے نوجوان لڑکوں کو دیکھ کر پیشانی تک سر ڈھانک لیتیں۔ بس صرف بچّے تھے جنھیں دُنیا کی کوئی فکر نہ ستا رہی تھی۔ وہ اسی طرح اُچھلتے کُودتے پھر رہے تھے جیسے عیدبقرعید اپنی گلیوں

میں کھیلا کرتے تھے۔

نومبر کا آدھا مہینہ گزر چکا تھا شام ہوتے ہی خنکی ہونے لگتی۔ یوں ہی ادھر ادھر دیکھتے دیکھتے ساجدہ کو سردی کا احساس بھی نہ ہوا تھا۔ ایک بچہ اس کے اتنے پاس سے دوڑتا ہوا گزرا کہ اس کا پاؤں کُچل گیا۔

شاید چھپن چھپول کھیل رہے ہیں۔ وہ اپنا پاؤں سہلاتی ہوئی اُٹھی اور امداد میں ملا ہوا کھردرا کمبل شانوں پر پھیلا لیا۔ کھانا ابھی تک بکس پر اسی طرح رکھا ہوا تھا۔ ابّا کو بھوک نہ لگ رہی تھی، اور وہ ابّا کے بغیر کھانا کھانے کو تیار نہ تھی۔

فورتھ ایئر کی ایک بچی کھچی کتاب بکس سے نکال کر وہ بجلی کے کھمبے کے پاس زمین پر پلتھی مار کر بیٹھ گئی۔ ابھی اس نے ایک ہی سطر پڑھی تھی کہ ایک عورت اس کے پاس آکر کھڑی ہو گئی۔ وہ اپنے دودھ پیتے بچے کو سُلانے کے لیے دیر سے تھپک تھپک کر ٹہل رہی تھی۔

"انگریجی پڑھ رہی ہو کہ اُردو؟ عورت نے پوچھا

"انگریزی"۔

"کیا کرو گی انگریجی پڑھ کر؟"

"کچھ نہیں۔" اس نے اکتا کر کہا۔ وہ عورت سے جان چھڑانا چاہ رہی تھی۔

"تمھاری اماں کہاں ہیں؟"

"گزر گئیں"۔ اس کی آواز میں دُکھ تھا

"چہ چہ، گزر گئیں۔ تمھاری سادی ہو گئی ہے؟"

"نہیں!"۔ وہ عورت کو نظر انداز کرنے کے لیے سر جھکا کر جیسے بڑے انہماک سے

پڑھنے لگی مگر کتاب کا ہر لفظ ایس بن گیا تھا۔ صلاح الدین، صلاح الدین، صلّو۔
اس نے کتاب بند کر دی عورت شاید اسے مغرور سمجھ کر جا چکی تھی۔

وہ جب سے یہاں آئی تھی اس یاد نے اس کے دل کو کس کس طرح تڑپایا تھا۔ جُدائی، ننھی ننھی یادوں کو بھی اس طرح جوان کر دیتی ہے کہ ان کے خیال ہی سے دل پر دھمک کا احساس ہوتا ہے۔ اسے یاد آیا کہ جب پہلی بار صلاح الدین اس سے ملا تھا تو اس نے یہی بتایا تھا:

"میرا نام صلاح الدین ہے مگر امّاں مجھے صلّو کہتی ہیں، سب مجھے صلّو کہتے ہیں، تم بھی یہی کہا کرو۔"

"اچھا۔" اس نے بجد سعادت مندی سے اقرار کر لیا تھا۔ اس کے بعد تو اس نے خوش ہو کر اسے اپنی ساری رام کہانی سنا ڈالی تھی۔ ہم گاؤں سے آئے ہیں وہاں ہماری زمین ہے، وہاں بہت سے درخت ہیں، آموں کے درخت، آموں پر جب بُور آتا ہے تو کوئلیں بہت بولتی ہیں۔ اور جب وہ ہماری امیوں کو کھاتیں تو میں غلیل سے انھیں مار ڈالتا۔

"ہائے اتم انھیں کیسے مار ڈالتے ہو؟" وہ حیران ہو گئی تھی۔

"لو، مارنا کون سا مشکل کام ہے۔ وہ تو کوئل ہے، لوگ تو آدمیوں کو مار ڈالتے ہیں۔ میری امّاں کے پاس آنا۔ ہاں۔ ہم یہاں پڑھنے کے لیے آئے ہیں،

ابّا نے زبردستی امّاں کو میرے ساتھ بھیجا ہے۔ ان کا یہاں جی تو نہیں لگتا۔" پھر وہ بڑے آدمیوں کی طرح اپنے بال جھٹکتا چلا گیا۔

دو نرسیں چند پیکٹ پکڑے بڑی تیزی سے آرہی تھیں۔ وہ ایک لمحے کو اس کے پاس رکیں۔

ہمارے ملک کی آبادی تو ابھی سے بڑھ رہی ہے وہ آگے بڑھ گئیں۔ ساجدہ ہنس پڑی " تو کیا وہ صرف یہ خوش خبری سنانے کے لیے اس کے پاس رکی تھیں"۔

صبح وہ ذرا دیر کو زچہ خانے کی طرف گئی تھی۔ بان کے کھرے پلنگوں پر زچائیں چادریں اوڑھے پڑی کراہ رہی تھیں اور نوزائیدہ بچّے ماؤں کے دوپٹوں میں پٹے پڑے تھے۔ شاید مائیں ننھّوں کے لباس کہیں راستے میں لٹا آئی تھیں یا اپنی جان بچانے کے لیے گھروں سے نکلتے وقت وہ ان زندگیوں کے جنم کو بھول گئی تھیں۔ انھیں یہ احساس ہی کہاں ہو گا کہ موت اور جنم بڑے سے بڑے "تغیر" کو ٹھوکر مار کر اپنے کو منوا لیتی ہیں۔

وہ اپنی جگہ کھڑی ہو گئی اور حقّہ پینے والوں کی ٹولیوں میں نظریں دوڑا کر ابّا کو ڈھونڈنے لگی۔

بوڑھا پھر چیخنے لگا: "کہاں ہے میری بیٹی؟ کہاں ہے میری بیٹی؟ ظالمو! میری بیٹی کو لا دو۔"

لوگوں نے سر اٹھا کر اِدھر اُدھر دیکھا اور پھر حقّہ پینے لگے۔

ساجدہ بے قرار سی ہو کر بوڑھے کی طرف بڑھنے لگی۔ وہ اس سے کیا کہے گی کیا سُنے گی؟ اس وقت اس کے ذہن میں کچھ بھی نہ تھا۔ وہ اس کے پاس جانے

کے لئے لمبے لمبے قدم اٹھا رہی تھی اور جب بوڑھا بابا اس سے دو تین قدم کے فاصلے پر رہ گیا تھا تو ایک شخص نے اپنے دونوں ہاتھ بُوڑھے کے شانوں پر رکھ دیئے تھے۔

"بابا! تم کس بیٹی کو پکار رہے ہو؟ وہ بیٹی نہیں تھی بابا! وہ لُوٹ کا سب سے قیمتی مال تھی۔ وہ تمھارے چیخنے سے واپس نہیں آئے گی۔ تمھاری آواز اس تک نہیں پہنچ سکتی۔"

بابا وحشت زدہ آنکھیں پھاڑے اس آدمی کو کھوئی کھوئی نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ ساجدہ کا جی چاہا کہ وُہ آگے بڑھ کر اس ظالم آدمی کے منہ پر ایک تھپڑ مار دے۔ وہ اس سے کہے کہ عورتوں کو لُوٹ کا مال کہنے والے لوٹنے والوں پر طنز کرتے ہوئے اُونچے تو نہیں ہو جاتے۔ پھر بھی وہ ضبط کئے چُپ چاپ کھڑی رہی۔

"تم جُھوٹ بول رہے ہو"۔ بوڑھا پھر چیخا "وہ میری بیٹی تھی، وہ مال خزانہ نہیں تھی۔ میری بیٹی، میری بیٹی۔"

"بابا! تمھاری بیٹی کے اغوا کا بدلہ چکے گیا ہے وہاں بھی بہت سے باپ تمھاری طرح رو رہے ہوں گے۔ لوٹ کا مال واپس بھی مل جائے تو پورا نہیں ہوتا۔"

"اچھا۔" بُوڑھے نے آستینیں چڑھا لیں "اچھا تو تم نے بھی بیٹیاں لوٹی ہیں!"

بوڑھے نے آدمی کو اتنے زور سے دھکا دیا کہ وہ گرتے گرتے بچا۔ اس نے ساجدہ کی طرف دیکھا اور کھسیانی ہنسی ہنس دیا "بابا! میں تم کو نہیں سمجھا سکتا، میں تم کو تسلّی نہیں دے سکتا۔" وہ جیسے ساجدہ سے کہہ رہا تھا "میں تم کو کیسے سمجھاؤں، لوگ یونہی بدلہ لیتے ہیں۔ یہ بہت پرانا چلن ہے بابا! تم نہیں جانتے اس چلن کے قید خانے

میں صدیوں سے کتنے بے گناہ قید کاٹتے چلے آ رہے ہیں۔"

بوڑھے نے کیا سنا، کیا سمجھا؟ وہ تو اب مارے غصّے کے اس کی طرف تمتما رہا تھا۔ آدمی سر جھکائے چل دیا اور حقّہ پینے والوں کی ٹولی میں غائب ہو گیا۔

"بابا!" ساجدہ نے آگے بڑھ کر آہستہ سے پکارا۔ بوڑھے نے اجنبیوں کی طرح اس کی طرف دیکھا اور پھر اس کی طرف سے پیٹھ موڑ کر یُوں بیٹھ گیا جیسے اب وہ کسی سے نہیں بولنا چاہتا۔

ساجدہ کچھ نہ کہہ سکنے کی حسرت دل میں لیے اپنے ٹھکانے کی طرف چل پڑی۔ جب وُہ حقّہ پینے والوں کی ایک ٹولی کے پاس سے گزری تو اسے ابّا کی آواز سنائی دی، وہ وہیں رُک گئی۔

"تم یہاں کہاں پھر رہی ہو بیٹا؟" ابّا نے حُقّے کے تابڑ توڑ کش لگائے اور پھر کپڑے جھاڑتے ہوئے کھڑے ہو گئے۔ ساجدہ نے دیکھا کہ ابّا اس آدمی سے بڑی گرم جوشی سے ہاتھ ملا رہے ہیں جو بُوڑھے کی بیٹی کو قیمتی۔ ل کہہ کر تسلّی دے رہا تھا۔

وہ اپنے چادروں کے گھر میں آ کر بکس کی ٹیک لیتے ہُوئے آرام سے پاؤں پھیلا کر بیٹھ گئی۔ اب اسے سخت بھُوک لگ رہی تھی۔ "ابّا شاید پھر حقّہ پینے بیٹھ گئے۔" اس نے سوچا "اگر ابّا اسی طرح خالی پیٹ حقّہ پیتے رہے تو جانے ان کی اس گرتی ہوئی صحت کا کیا انجام ہو گا۔"

اب عشا کی اذان ہو رہی تھی اس لیے لوگوں کے بولنے کی آوازیں تھم گئی تھیں۔ نماز کے بعد رات دس گیارہ بجے تک گراموفون ریکارڈ بجتے رہے۔

پاکستان میں صحیح سلامت پہنچنے کی خوشی کا اظہار رات کو شدت اختیار کر جاتا۔ بعض اچھی آوازوں والے لڑکے خود بھی ایک تان لگا دیتے۔ ساجدہ کو یہ سب کچھ اچھا نہ لگتا۔ وہ بڑی یکسوئی کے ساتھ کچھ سوچنا چاہتی تھی۔ وہ اپنی یادوں کو جگا کر ایک انجانی سی مسرت سے ہمکنار ہونا چاہتی تھی۔ مگر روز یہی ہوتا کہ ہزاروں بار کے سُنے ہوئے گھسے پٹے ریکارڈ اس کی یادوں کی مٹھاس چاٹ جاتے۔ اس وقت اسے ایسا محسوس ہوتا کہ اس کی یادیں ایک گھسا ہوا ریکارڈ ہیں جس پر رکھی ہوئی سُوئی ایک ہی جگہ اٹک گئی ہے۔

ابّا جب اپنا چھوٹا سا حُقّہ اٹھائے آئے تو وہ آدمی بھی ان کے ساتھ تھا۔

"اچھا نواب کل ملاقات ہو گی ناظم صاحب!"

"خدا حافظ۔" ناظم چلا گیا۔

"یہ کون ہے ابّا، کیا دلی کی گلیوں کا رہنے والا ہے؟" اس نے پوچھا

"نہیں، سجو بیٹا! یہ تو کانپور کے رہنے والے ہیں۔ بڑا لائق آدمی ہے، یہاں حکومت نے بحالیات کے محکمے میں کام دے دیا ہے۔ کیا کہنے، واہ، وا،، بہت نفیس آدمی ہے۔" ابّا بہت خوش نظر آ رہے تھے۔ "روٹی کھا لیجئے ابّا!" اسے افسوس ہو رہا تھا کہ ابّا کس بیہودہ آدمی کی تعریف کر رہے ہیں۔ ابّا سے تو جو بھی پیار سے بول دے اچھا ہو جاتا ہے۔

ساجدہ نے روٹی اور دال کا پیالہ ابّا کے سامنے رکھ دیا اور پھر ان کے ہاتھ سے حقّہ لے لیا۔ ابّا ہنس پڑے۔ "بٹیا کو تو میرے حقّے سے دشمنی ہے۔"

"روٹی کھائیے، دھُوئیں سے پیٹ نہیں بھرتا ہے۔"

"قسم لے لو بیٹا! جو مجھے ذرا سی بھُوک لگی ہو۔ دوپہر کی روٹی ابھی تک ہضم

نہیں ہوئی، تم کھاؤ، رات گئے بھوک لگی تو پھر کھاؤں گا۔" وہ لپیٹے ہوئے بستر کو بچھا کر لیٹ گئے۔ ساجدہ کو اکیلے کھانا کھانا زہر لگ رہا تھا۔

"ابّا! ہم لوگ کسی گاؤں میں آباد ہوں گے۔ کہاں ہوگا سرگودھا؟ بس سرگودھا کے آس پاس۔ کیوں ابّا؟ میں وہاں کسی اسکول میں بچّوں کو پڑھاؤں گی۔"

"گاؤں۔ وہ بھی سرگودھا کا گاؤں۔ کیا رکھا ہے وہاں، اری پگلی! گاؤں میں کیا رکھّا ہے؟"

"سکون!"

ابّا نے لالٹین کے ملگجے اندھیرے میں آنکھیں پھاڑ کر اپنی بیٹی کو دیکھا "تھک گئی ہے میری بیٹیا، گھر کے بغیر اداس ہے۔ روٹی کھا لو۔ پھر آرام سے سو جاؤ۔ بس کیمپ سے نکلنے کی دیر ہے۔ میری بیٹا نے پڑھائی شروع کر دی تو پھر خوش رہے گی۔ ایم اے تک پڑھاؤں گا۔ اب کیا ہے اب تو اپنے ملک میں ہیں۔"

اس نے دُکھ سے ابّا کی طرف دیکھا۔ اونچی دُکان پر نیچی تنخواہ کے عوض حساب کتاب کرتے ساری زندگی گزر گئی۔ ابّا اس کے لیے اس سے زیادہ اور کیا سوچ سکتے تھے کہ اسے ایم اے تک پڑھاویں پھر انھیں ایک لائق داماد مل جائے اور بس۔ حساب کی پوتھی میں دل اور دلداری کے کوئی ہندسے نہیں ہوتے۔ اب وہ ابّا سے کیسے کہتی کہ وہ گاؤں میں کیوں آباد ہونا چاہتی ہے!

ابّا سو گئے تھے اور ہلکے ہلکے خرّاٹے لے رہے تھے۔ وہ بھی اپنا بستر بچھا کر لیٹ گئی۔ درخت کی شاخوں کے بیچ سے کہیں کہیں آسمان نظر آ رہا تھا۔ کوئی بسیرا لینے والا پرندہ جانے کیوں پھڑپھڑایا اور ایک پتہ ٹپ سے ساجدہ کے اوپر آ گرا

جسے اٹھا کر وہ آہستہ آہستہ انگلیوں سے مسلنے لگی۔ اس کی انگلیاں نمی محسوس کر رہی تھیں۔ اس نے ایک لمحے کو سوچا۔ ابھی یہ پتہ پوری طرح سوکھا نہیں تھا ابھی اس میں زندگی باقی تھی۔ صلّو کی دی ہوئی ادبی کتابوں کو پڑھ پڑھ کر وہ کچھ زیادہ ہی حساس ہوگئی تھی۔

اب کئی طرف سے گراموفون ریکارڈوں کی بوچھار شروع ہوگئی تھی "آیئے آجایئے، پھر مری آغوش میں آجایئے۔ رِم جھم برسیں بادروا، مست ہوائیں آئیں۔ سوجا راجکماری سوجا، سوجا میں بلہاری سوجا۔"

کوئی بہت زور سے دھاڑا "بند کرو، کان پک گئے ان گانوں کو سُن سُن کر، پھینک دو ان ریکارڈوں کو، شرم نہیں آتی انھیں بجاتے۔" سب ریکارڈیوں خاموش ہوئے جیسے ٹوٹ گئے ہوں۔

"بچّو! اپنے ملک کے گانے بجاؤ۔"

"میرے مولا! بلا لو مدینے مجھے، میرے مولا! بلا لو۔"

"اب ہوئی کوئی بات، واہ۔" کوئی بے پناہ داد دے رہا تھا۔

ساجدہ نے جھک کر ابّا کو دیکھا۔ کہیں اس داد و بیداد نے انھیں جگا تو نہیں دیا۔ مگر ابّا ٹھنڈی ہوا میں بڑی غفلت کی نیند سو رہے تھے۔ ان کے چہرے پر بڑی پیاری مسکراہٹ تھی شاید وہ کوئی بہت اچھّا خواب دیکھ رہے تھے۔

"وہ چلے جھٹک کے دامن مرے دستِ ناتواں سے، وہ چلے۔" یہ کسی لڑکے کی آواز تھی جو نوٹنکی کی طرز پر گا رہا تھا۔ ساجدہ غور سے سُننے لگی۔ بچپن میں سُنی ہوئی یہ طرز آج اسے بہت اچھی لگ رہی تھی۔

"ابے چُپ رہ۔ پاکستان میں اب یہ بُری عادتیں نہ چلیں گی۔ وہاں نوٹنکی کے پیچھے دیوانہ رہا اور اب یہاں بھی۔"

تان لیتی ہوئی آواز دم توڑ گئی۔ اس کے ساتھ ہی سب خاموش ہو گئے، کیونکہ اب بُوڑھا چیخ رہا تھا" اس کا دامن میرے ہاتھ میں رہ گیا ہے۔ میری بیٹی کہاں ہے؟ وہ کہاں ہے؟"

ساجدہ نے ایک لمحے کو سوچا اگر بوڑھے کی بیٹی کی طرح اسے بھی اغوا کر لیا جاتا تو —— اس پر ایک دم دہشت طاری ہو گئی اس پر تو صرف خیال ہی سے دہشت طاری ہو گئی تھی، اسے کیا پتا تھا کہ جبر کے دانت اتنے زہریلے ہوتے ہیں جن کے توڑ کا آج تک کوئی ٹیکہ ایجاد نہیں ہوا۔

بوڑھے کے رُوپ میں ابّا کو دیکھ کر وہ رو پڑی اور جب اس خیال کا غبار اس کے سینے سے چھٹ گیا تو اسے احساس ہُوا کہ وہ تو بوڑھے کے لیے رو رہی تھی۔ رونے کے بعد جب اسے قرار آیا تو وہ بغیر کسی جدّوجہد کے گھری نیند میں ڈوب گئی۔ سونے سے پہلے آج اس نے آسمان کو دیکھتے ہُوئے یہ بھی نہ سوچا تھا کہ لوگ آسمان کو چھت کیوں کہتے ہیں۔ اور اگر یہ چھت ہے تو پھر انسان اس کے تلے خود کو اتنا غیر محفوظ کیوں سمجھتا ہے؟ سونے سے پہلے اسے گھر کی چھت بے طرح یاد آتی۔

وہ خواب میں صلاح الدّین کو دیکھ رہی تھی۔ وہ سامان باندھے لاہور روانہ ہونے کے لیے تیار تھی اور کیمپ میں پھر پھر کر اپنے گلی محلے والوں سے مل رہی تھی۔ ان سے پُوچھ رہی تھی کہ کون کہاں جا رہا ہے۔ اور وہ جو ابھی نہیں جا رہے تھے ان سے ہمدردی کر رہی تھی۔ انھیں تسلّی دے رہی تھی، وہیں اسے صلّو کچھ ڈھونڈتا نظر آیا۔

"تم ابھی تک گئے نہیں۔ تم یہاں کیسے آ گئے؟ کیا تم نے اماں کو محفوظ مقام پر پہنچا دیا ہے؟"

"تم ہم سب کی فکر نہ کرو۔ میں تم سے ملنے آیا ہوں۔ ابّا نے فیصلہ کیا ہے کہ ہم سب سرگودھا جائیں گے یا آس پاس کے کسی گاؤں میں رہیں گے۔"

"سرگودھا کے کسی گاؤں میں؟" اس نے اپنے اطمینان کے لیے پھر سے پوچھا "ہم لوگ لاہور جا رہے ہیں۔"

"پروا نہ کرو میں تو شہر میں ہی کسی کالج میں لکچرر ہو جاؤں گا۔"

"مگر ——— مگر مجھے کیسے معلوم ہو گا صلّو؟" وہ رو رہی تھی۔

"مت رو ——— تمھیں ڈھونڈ ہی لیں گے کہیں نہ کہیں"۔ وہ ہنسا تو اس کے خشک ہونٹوں کی پپڑی سے خون کا ایک قطرہ اُبل پڑا۔ وہ اس قطرے کو اپنے

پلّو میں جذب کرنا چاہتی تھی مگر صلّو ایک دم نظروں سے غائب ہوگیا۔

اس کی آنکھ کھُل گئی۔ وہ اتنی سرد رات میں پسینے سے نہا گئی تھی۔ اس کے ہونٹ آہستہ آہستہ ہلے "تمھیں ڈھونڈ ہی لیں گے کہیں نہ کہیں۔" وہ حیران تھی کہ کیا خواب اتنے سچّے بھی ہوتے ہیں!

دُور سے سیّاروں کے چیخنے کی آوازیں آرہی تھیں۔ شاخوں سے جھانکتے ہُوئے آسمان پر صبح کا دُور دُور پتا نہ تھا۔ اس نے چادر کا کونا سرکا کر باہر جھانکا۔ جانے کون لالٹین اٹھائے جُھک جُھک کر ہر طرف آہستہ آہستہ پھر رہا تھا سیّاروں کی آواز اور پھر کسی کا ایسے پُراسرار طریقے سے پھرنا ——— اس کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ اس نے ڈر کے مارے کمبل سے چہرہ چھپا لیا۔ اس کا جی چاہ رہا تھا کہ ابّا کو جگا دے مگر اس سے بولا نہ گیا" ہو گا کوئی۔ کیمپ میں چور ڈاکو تو آنے سے رہے۔" اس نے اپنے آپ کو تسلّی دی پھر اسے ایک دم محسوس ہوا کہ لالٹین کی روشنی کمبل سے چھن کر اس کی آنکھوں میں گھس رہی ہے۔ اس نے آنکھوں پر سے کمبل ذرا سا کمبل ذرا سا سرکایا۔ لالٹین اس کے سامنے ڈول رہی تھی ——— اس نے آنکھیں بند کرلیں اور پُوری طاقت سے چیخ پڑی۔ ساتھ ہی بوڑھے کی آواز اس کی آواز میں شامل ہوگئی "یہیں ہے، وہ یہیں ہے، وہ ابھی چیخی تھی۔ میری بیٹی، میری بیٹی۔"

کیمپ کے بہت سے لوگ جو اس کی چیخ سُن کر ادھر آرہے تھے۔ لَوٹ گئے۔۔ وہ جانے کیا کہہ رہے تھے شاید جاگ پڑنے کی وجہ سے ناراض ہو رہے تھے۔ ابّا ساجدہ کے سر پر ہاتھ رکھے بُوڑھے کو گھور رہے تھے۔

"تم راتوں کو بھی شور مچاتے ہو، بھاگ جاؤ یہاں سے۔" ابّا نے بوڑھے کو گھورا، مگر وہ ڈری ہوئی ساجدہ کو اس طرح دیکھ رہا تھا جیسے کچھ سوچ رہا ہو۔ کون کیا کہہ رہا ہے، اسے اس کی پروا نہ تھی۔

"بابا! میں چیخی تھی، میں ڈر گئی تھی!" ساجدہ اپنے بستر پر اُٹھ کر بیٹھ گئی۔

"کیا سب لڑکیاں ایک ہی طرح چیختی ہیں؟"

"ہاں بابا!" ساجدہ نے اپنا ٹھنڈا ہاتھ بڑھا کر بابا کے ہاتھ پر رکھ دیا۔

"میں سمجھا، میں سمجھ گیا۔ کیا تم بھی قیمتی مال ہو؟"

"چلو بابا! چلو تو یہاں سے، اب بکواس مت کرو۔" ابّا نے بابا کے شانے پر سختی سے ہاتھ رکھا تو لالٹین بوڑھے کے ہاتھ سے گر پڑی۔ "یہ لالٹین اٹھا کر رکھ دو بیٹا! جانے کس کی اٹھا لایا ہوگا۔" ابا بوڑھے کو تقریباً کھینچتے ہوئے لے چلے۔ "اپنے بستر پر لیٹ کر چپکے سے سو جاؤ، صبح تمھاری بیٹی آجائے گی۔"

ابا جب بُوڑھے کو چھوڑ کر واپس آئے تب بھی بڑبڑا رہے تھے "پاگل ہو گیا ہے سب کی نیندیں حرام کر دی ہیں۔" وہ اپنے بستر پر لیٹ گئے۔ "سو جاؤ بیٹا! سو جاؤ ابھی تو آدھی رات گزری ہے۔ خدا کسی کو پاگل نہ کرے۔"

ساجدہ نے ابّا کو کوئی جواب نہ دیا۔ ان کی طرف دیکھا بھی نہیں۔ وہ بوڑھے کو جس طرح کھینچتے ہوئے لے گئے تھے اس کی اذیت وہ ابھی تک محسوس کر رہی تھی۔

ابا سو گئے تھے مگر وہ ایک لمحے کو بھی آنکھ نہ جھپکا سکی۔ شاخوں سے چھنتے ہوئے نیلے آسمان کو اس نے سفید ہوتے دیکھا۔ پرندوں کا شور سنا اور جب وہ پر پھڑپھڑا کر اُڑ رہے تھے تو ننھی ننھی شاخوں اور پتوں کو کمبل پر سے چُنتے ہوئے اس نے عجیب سی

مسرّت محسوس کی۔ اس نے چادر کی دیوار ایک طرف سرکا دی اب لوگ لوٹوں اور کٹوروں سے وضو کر رہے تھے۔

اس نے آہستہ سے پکارا: "ابّا! صبح ہو گئی۔" اسے صبح ہمیشہ خوبصورت لگتی تھی۔

ابّا نے کروٹ لے کر محبت سے اس کی طرف دیکھا۔

"تم اُٹھ گئیں؟ بیٹا! کیا کر رہی تھیں؟"

"دُعا۔"

"کیا دُعا مانگ رہی تھیں؟"

"بس یُوں ہی سی دُعا ابّا۔" وہ بوکھلا گئی "بس یہی کہ اے اللہ! ہمارے گناہوں کو معاف کر دے۔" اس نے یُوں ہی کہہ دیا۔

"بھلا یہ دُعا کیا ہوئی پگلی!" ابّا! ایک دم سنجیدہ ہو گئے "ہم نے کبھی کون سا گناہ کیا ہے۔ جب تمھاری امّاں نے منہ موڑا تو تم کو پالتے ہوئے یہ بھی نہ دیکھا کہ دنیا میں کچھ اور بھی ہے۔" وہ لوٹا اٹھا کر باہر چلے گئے تو ساجدہ کو ہنسی آ گئی۔ خود تو ابّا ہمیشہ یہی دُعا کرتے تھے مگر آج اس کی زبان سے نکلی ہُوئی یہی دُعا ان کے لیے طعنہ بن گئی۔

نماز کے بعد لوگ دُعائیں مانگ رہے تھے۔ جانے وہ کون سی دعائیں مانگ رہے تھے۔ ساجدہ کو ایک بار تو ایسا محسوس ہوا کہ اتنے بہت سے پھیلے ہوئے ہاتھوں میں ساری دُنیا کی آسائشیں سمیٹ لینے کی تمنّائیں پھڑک رہی ہیں۔ اسے امّاں یاد آ گئیں۔ امّاں کی جہاں اور بہت سی باتیں وُہ بھُول گئی تھی وہاں کچھ یاد بھی رہ گئی تھیں۔ امّاں جب اپنے کسی عزیز کو دولت کے چکر میں دیکھتیں تو بڑے دُکھ سے کہتیں

"کوئی مجھے سونے کا نوالہ کھا کر دکھائے تو جانوں۔"

ابا ان کو چھیڑتے: "مگر انسان تر نوالہ تو کھا سکتا ہے۔"

ویسے ابا اماں کی قناعت پسندی سے بہت خوش رہتے اور جب اماں مری تھیں تو ابا رو رو کر سب کو یہی بتاتے تھے کہ اس قناعت پسند بی بی نے مجھ سے کبھی کوئی فرمائش بھی نہیں کی۔

اب سوئے ہوئے بچے اُٹھ کر اودھم ڈھا رہے تھے۔ کچھ رو رہے تھے۔ کچھ کھانے پینے کی فرمائش کر کے ماؤں کے آنچل کھینچ رہے تھے۔ عورتیں انھیں جھڑک رہی تھیں، پیٹ رہی تھیں۔ ایک عورت کی آواز سب سے اُونچی تھی "ارے کمبختو! ہم یہاں کون سا گھر والا کر رہے ہیں تین دن سے بیٹھے خیرات کی روٹیاں توڑ رہے ہیں۔"

ساجدہ کو یہ الفاظ تیر کی طرح محسوس ہُوئے۔ وہ سوچنے لگی بعض لوگ کسی بھی بات سے خوش نہیں ہوتے۔ جذبے کی کسی رُوح کو پانے کی کوشش نہیں کرتے۔

یہ آخر اتنے انجانے پن سے کیوں کام لیتے ہیں آوہ نوجوان لڑکے یاد آ گئے جو مَیلی مَیلی شلواروں اور قمیصوں میں ملبوس تھے مگر سیکڑوں روپوں سے تیار کی ہوئی کھانے کی دیگیں اور نانوں کے جھولے کیمپ میں پہنچا رہے تھے۔ کھانا بانٹتے ہُوئے ان کے چہرے مسرت سے تمتما اُٹھتے۔ وہ سب سے کہتے: "پاکستان تمھارا ہے بھائیو! ہم تو تمھارے خادم ہیں۔"

بچوں کا ایک شور برپا ہُوا۔ ریڑھوں پر لدی ہوئی دیگیں اور نانوں کے جھولے اتارے جا رہے تھے۔ بچے ماؤں کے آنچل چھوڑ کر اب دیگوں کے گرد مکھیوں کی

طرح بھنبھنا رہے تھے۔ ایک گورے سے جوان لڑکے نے نعرے کی طرح آواز لگائی: "آج ہم چائے بھی لائے ہیں بادشاہو! حلیم بھی ہے بھائیو۔" پھر وہ بچّوں کو ایک طرف کرنے لگا "بس ذرا دیر صبر کرو بچّو۔ چائے ٹھنڈی ہو گئی ہے۔" لڑکے نے پھرتی سے اینٹوں کا چولھا بنایا اور پھر سوکھی ہوئی شاخیں، پتّے اور کاغذ کے ٹکڑے ٹھونس کر آگ جلا دی۔ چائے گرم ہو رہی تھی اور پھر وہ مارے خوشی کے بچّوں کو گھیرے میں لے کر ناچنے لگا "چائے پیو گرم گرم، روٹی کھاؤ نرم نرم۔" بچّے بھی اس کے ساتھ گا رہے تھے — چائے پیو ——————

ساجدہ کو یہ سب کچھ اتنا پیارا لگا کہ وہ گلاس اٹھا کر تقریباً بھاگتی ہوئی وہاں پہنچ گئی اور بچّوں کے نرغے کو توڑ کر اس نے اپنا گلاس لڑکے کی طرف بڑھا دیا۔ لڑکا شرما کر کھڑا ہو گیا۔

"سب سے پہلے میں چائے پیوں گی۔"

"باجی! آپ ہمارے حصّے کی چائے بھی پی لیں، ابھی میں نے بھی نہیں پی۔"

"سچ؟" ساجدہ نے اسے پیار سے دیکھا "تمھارا نام کیا ہے؟"

"غلام محمد، ویسے سب لوگ مجھے 'گامے' کہتے ہیں۔ پیارا کا نام ہے باجی! اور یہ دیگ میں لایا ہوں باجی! میں نے چندہ جمع کیا تھا باجی! لوگ مجھے لڑکا سمجھ کر چندہ نہیں دیتے تھے۔" لڑکے نے ایک ہی سانس میں اپنا کارنامہ سنا دیا۔

"پھر تو یہ چائے بہت مزے کی ہو گی۔"

"پی کے دیکھیں باجی!" لڑکے نے اس کا گلاس لبالب بھر دیا۔

ساجدہ آنے کو تو آ گئی تھی مگر جب اس نے لوگوں کو دیگوں کی طرف آتے

دیکھا تو اسے احساس ہوا کہ ان میں کوئی عورت نہ تھی۔ وہ جس طرح آئی تھی اس سے بھی زیادہ تیزی سے بھاگ پڑی اور جب وُہ اپنی جگہ پر پہنچی تو دیکھا کہ ابّا انگوچھا کندھے پر ڈالے، کٹورا اور گلاس لیے دیگوں کی طرف جا رہے ہیں۔

ساجدہ اپنے بکس پر بیٹھ کر مزے مزے چائے پینے لگی۔ گُڑ کی بنی ہُوئی اس نیم گرم چائے نے اس وقت سارے ذائقوں کو مات کر دیا تھا۔

"اتنی اچھی چائے تو خود میں نے بھی کبھی نہیں بنائی۔" جیسے اب بھی وُہ لڑکے سے باتیں کر رہی تھی اور بار بار مسکرائے جا رہی تھی۔

"میں نہیں کھاؤں گا، میں نہیں کھاؤں گا، میری بیٹی کہاں ہے؟ میں نے اس کی چیخ سُنی تھی۔"

اس نے گلاس رکھ دیا۔ مسرّت کے لمحے بوڑھے کی چیخوں تلے دم توڑ گئے۔ جانے بابا نے کب سے کچھ نہیں کھایا ہوگا۔ وہ بابا کو کس طرح تسلّی دے۔ وہ اس وقت سخت الجھن محسوس کر رہی تھی: ایک مرد لوٹتا ہے، دُوسرا لُوٹ پر طنز کرتا ہے، تیسرا لُوٹ کے غم میں پاگل ہو جاتا ہے اور ــــــــــ

ابّا کھانے پینے کا سامان لیے جوانوں والی چال سے واپس آ رہے تھے۔ کیا یہ مسرّت اور بے فکری صرف اسے دکھانے کے لیے ہے۔ "ابّا کو اپنا گھر چھُوٹنے کا غم ہے" اور وہ اس غم کو کس کس طرح چھپا رہے ہیں۔"

"لو بیٹا! خُوب گرم ہے۔ ایسی مزے کی چائے تم نے کبھی کاہے کو پی ہو گی۔ اور یہ دیکھو حلیم ہے، ساری رات پکائی جاتی ہے، بالکل ایسے ہی جیسے تم کھچڑا پکاتی تھیں۔"

ساجدہ نے گلاس اٹھا لیا اور ساڑھی کے پلّو سے پکڑ کر آدھی چائے اپنے گلاس

میں ڈال لی اور گلاس ان کی طرف بڑھا دیا۔

"ابّا! کیا سچ مچ آپ بہت خوش ہیں؟"

"ہاں بیٹا! زندہ سلامت اپنے ملک میں آ گئے، خوش نہ ہوں گا!" وہ چائے کے گھونٹ پینے لگے۔

"تو پھر آپ تھوڑی سی نان کھا لیجئے، آپ نے رات کو بھی کچھ نہیں کھایا۔"

"نہیں بیٹا! تم کھاؤ، مجھے ایسا لگتا ہے جیسے کسی نے معدے کے مُنہ پر ڈھکن رکھ دیا ہو، بھُوک تو لگتی ہی نہیں۔"

ساجدہ نے ابّا کو غور سے دیکھا مگر وہ بڑے سکُون سے چائے پی رہے تھے۔ بھوک نہیں لگتی، وُہ سوچنے لگی۔ "امّاں نے بارہ سال تک پائی پائی جمع کر کے دو کمروں کا پکّا مکان بنوایا تھا۔ اسے اچھّی طرح یاد تھا، جب وہ چھوٹی سی تھی تو ایک کچّی کوٹھری میں رہتی تھی۔ برسات میں امّاں ساری رات سامان کو اِدھر سے اُدھر رکھتی رہتیں اور ابّا چھت کے سوراخوں کو بند کرنے کی کوشش میں چھینک چھینک کر بے حال ہو جاتے تو پھر انھیں غصہ آنے لگتا۔ امّاں انھیں چائے بنا کر پلاتیں اور تسلّی دیتیں "کوئی سدا تو اس گھر میں نہیں رہنا۔"

نئے گھر میں آ کر امّاں نے بڑے فخر سے کہا تھا: "دیکھا تم نے سجّو کے ابّا! میں نے ماٹی چن چن کر محل بنایا ہے۔ انھوں نے اپنے محل میں موتیے کا پودا لگایا تھا اور چنبیلی کی بیل دیوار پر چڑھائی تھی، وہ اپنے محل کو طرح طرح سے سجانے میں لگی رہتیں۔ مگر محل بناتے اور سجاتے ہُوئے وہ اتنی تھک گئی تھیں کہ کچھ ہی دن بعد ساون کی ایک رِم جھم برستی رات میں وہ ایسے سکون سے پاؤں پھیلا کر سوئیں کہ پھر نہ اٹھیں۔ مگر ابّا نے امّاں

کی جگہ کو جلد ہی پُر کر دیا تھا، وہ منہ اندھیرے اُٹھتے، گھر کی صفائی کرتے، چائے بناتے اور موٹی چھوٹی روٹیاں پکاتے، پھر اسے پیار سے جگاتے، ناشتہ کراتے اور جب وہ کپڑے بدل کر تیار ہو جاتی تو گھر میں تالا ڈال کر اسے اسکول چھوڑتے اور خود دکان چلے جاتے۔ کچھ دن بعد اس نے خود ہی گھر سنبھال لیا تھا۔ ابّا اسے گھر صاف کرتے دیکھتے تو ناراض ہونے لگتے "یہ تمھارا کام نہیں بیٹا! تم کو اس لیے تھوڑی پڑھا رہا ہُوں کہ ایسے گھٹیا کام کرو؟" وہ رنجیدہ ہو جاتی۔ "اور یہ کام آپ کے لیے بڑھیا ہیں؟ ابا! ایسی باتیں نہ کیا کریں۔"

شام کو جب ابا دکان سے لوٹتے تو گھوم پھر کر گھر کی ایک ایک چیز کو دیکھتے پھر موتیے اور چنبیلی کو پانی دیتے۔

"بیٹا! یہ چنبیلی کی پتیاں کون نوچتا ہے؟" ابا اس سے پُوچھتے تو وہ شرمندہ ہو جاتی، چپکے سے کسی کام میں لگ جاتی۔ وہ ابا کو کیسے بتاتی کہ جب آپ رات کو حقّہ پینے دوستوں کے پاس جاتے ہیں تو صلّو اس سے ملنے آتا ہے۔ وہ اسے دیکھ کر ساری باتیں بھول جاتی ہے اور بس یُوں ہی پتّیوں کو توڑنے لگتی ہے۔

اس نے پھر غور سے ابّا کی طرف دیکھا مگر ان کے سپاٹ چہرے پر کچھ بھی نظر نہ آ رہا تھا۔ بھلا یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ ابّا کو گھر نہ یاد آ رہا ہو۔ وہ تو چنبیلی کی ایک پتّی کا ٹوٹنا بھی برداشت نہ کر سکتے تھے۔ کبھی کبھی وہ بڑے چاؤ سے کہتے تھے: "سجّو کی امّاں کا بنایا ہوا محل میں اپنے داماد کے نام کروں گا۔ ہاں! وہ بھی کیا یاد کرے گا، ہماری بٹیا کے پاؤں دھو دھو کر پیئے گا۔"

اور جب پاکستان بننے کے بعد فساد کی آگ تیز ہُوئی اور اپنا محلہ بھی خالی ہونا

شروع ہُوا تو بھی ابّا گھر چھوڑنے کو راضی نہ تھے۔ مگر جب انھیں احساس ہُوا کہ گھر پہ ایک چھوڑ دس دامادوں کی یلغار ہونے والی ہے تو گھر کے دروازے بند کرنا بھی بھُول گئے تھے۔ دل میں پناہ گزینوں کے کیمپ میں انھوں نے سر جھکائے جھکائے اپنے محل کا نوحہ پڑھا تھا " ماٹی چُن چُن محل بنایا، لوگ گھر میرا ——— "

سوچتے سوچتے اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ ماضی کی یادوں کے ویرانے سے بچنے کے لیے وُہ باہر دیکھنے لگی۔ جانے کیوں بہت سے لوگ ایک ہی جگہ جمع ہو رہے تھے اس ہجوم میں اسے ڈاکٹر بھی نظر آ رہا تھا۔

" یہ لوگ کیوں جمع ہو رہے ہیں ابّا؟ "

" معلوم نہیں بِٹیا۔ " ابّا نے اچٹتی سی نظر سے باہر دیکھا۔ " چائے سے میرے پیٹ کو بہت فائدہ ہوا ہے۔ "

" اچھا! " وہ اتنی دیر سے یوُں ہی چائے کا گلاس پکڑے بیٹھی تھی۔ اب اسے یاد آیا تو چائے ٹھنڈی ہو گئی تھی۔

بوڑھے کی ایک چیخ بلند ہُوئی " میری بیٹی، میری بیٹی۔ " لوگوں کے بولنے کی آوازیں بھی آ رہی تھیں مگر دوری کی وجہ سے سمجھ میں نہ آ رہا تھا کہ وہ سب کیا کہہ رہے ہیں۔

" ابّا! جا کر دیکھیے تو سہی، کیا بات ہے! " وہ بے چین ہو رہی تھی

" کیا دیکھوں بِٹیا! بے چارہ پاگل ہو گیا ہے۔ ابّا چلم میں تمباکو بھرنے لگے " ابھی چُپ ہو جائے گا، تم خواہ مخواہ پریشان ہوتی ہو۔ "

بوڑھا آخری چیخ کے ساتھ خاموش ہو گیا۔ لوگ بکھرنے لگے۔ ارے سب

لوگ بیحد سنجیدہ نظر آرہے تھے۔اسے موت کے بعد چھانے والی ویرانی کا احساس ہو رہا تھا۔

"ابّا! کہیں بوڑھا بابا مر تو نہیں گیا؟ سب جمع ہوئے پھر سب بکھر گئے، آخر کیوں؟"

"کچھ بھی نہیں بِٹیا! میں ابھی ذرا دیر پہلے اسے دیکھ کر آرہا ہُوں، درخت تلے آرام سے بیٹھا تھا۔تم یُوں ہی ساری دُنیا کی فکر میں مبتلا رہتی ہو۔" ابّا آنکھیں موند کر حقّے کے کش لگانے لگے۔

اسے ابا کی بےحسّی پر غصّہ آرہا تھا۔اس کا جی چاہ رہا تھا کہ ابّا سے کہے آپ کے خیال میں تو بوڑھا حساب کتاب کی پوتھی ہے۔اور اس پوتھی میں صرف رقم درج ہوتی ہے جذبات نہیں۔

وُہ باہر نکل آئی اور ہر طرف دیکھنے لگی۔اس کی نظریں بوڑھے کو تلاش کر رہی تھیں جس درخت تلے وہ گھنٹوں چُپ چاپ بیٹھا رہتا تھا اب وہاں بچّے کھیل رہے تھے۔

اس نے دیکھا ناظم تیز تیز قدم اٹھاتا اس کی طرف آرہا تھا۔جب وہ اس کے قریب آگیا تو اس نے بے اعتنائی سے نظریں جُھکا لیں۔

"آپ کے ابّا کہاں ہیں؟"

"بوڑھے بابا کو کیا ہُوا؟ لوگ جمع تھے اور وہ چیخ رہا تھا، اب کہیں نظر نہیں آتا۔"

"ڈاکٹر نے اسے پاگل خانے بھیج دیا ہے، سُنا ہے کل رات وہ سب کو تنگ کرتا رہا۔آپ بھی ڈر گئی تھیں؟"

"تو بابا کو پاگل خانے بھیج دیا گیا۔"لوگ اسے رخصت کرنے کے لیے جمع ہوئے تھے

اس کا دل بھر رہا تھا" خدا حافظ بابا!" اس نے دل ہی دل میں کہا۔ اسے دُکھ تھا کہ وہ بابا کو الوداع نہ کر سکی۔ اسے اس وقت یہ احساس ہی نہ تھا کہ بابا ان سب باتوں سے بہت دُور جا چکا ہے۔ اس کا دماغ چیخوں کا ایک ریکارڈ ہے جسے یاد کی سُوئی اس وقت تک بجاتی رہے گی جب تک گھس نہ جائے گی پھر ریکارڈ میں گڑھے پڑ جائیں گے اور پاگل خانے کو اس سے نجات مل جائے گی۔

"آپ بہت رنجیدہ ہیں؟ شاید بابا وہاں ٹھیک ہو جائے۔ یہ پاگل خانے حساس لوگوں کے لیے ہی بنائے گئے ہیں۔"

"مجھے تو آپ بھی بہت حساس لگتے ہیں۔" ساجدہ نے جل کر کہا

"مجھے تو آپ بھی بہت حساس معلوم ہوتی ہیں۔" وہ بے ساختہ ہنس پڑا اور پھر ایک دم سنجیدہ ہو گیا۔ "اگر کبھی سائنسدانوں نے فضا میں بکھری ہوتی چیخوں کو ریکارڈ کر لیا تو کیا ہو گا۔ پھر یہ مہذب انسان کو کون سا احساس دیں گی؟" سب جنگلوں میں بھاگ جائیں گے اور پتوں کا لباس پہن لیں گے مگر ان میں آپ شامل نہیں ہوں گے۔"

ابا اندر ہیں۔" ابا! ناظم صاحب آئے ہیں۔" وہ چند قدم ہٹ کر کھڑی ہو گئی اور ادھر اُدھر دیکھنے لگی۔ اس نے یہ بھی نہ دیکھا کہ ناظم اسے کتنی حیرت سے دیکھ رہا تھا۔

ابا جیسے جھپٹ کر باہر آئے۔" اوہ تو آپ آ گئے۔ آپ کو ہمارا کتنا خیال ہے! ایسے لوگ کہاں ہوتے ہیں، بیٹھئے اندر چلیے۔" ابا خواہ مخواہ ہنسے جا رہے تھے

"ابھی میں جلدی میں ہوں، کل آؤں گا تو بیٹھوں گا۔ اچھا تو اب آپ تفصیل بتائیں، آپ وہاں کیا کیا چھوڑ آئے ہیں؟"

"ارے ناظم صاحب! نہ پُوچھیے کہ کیا کیا چھوڑ آیا ہُوں۔ پانچ کمروں کا مکان،

ایک بہت بڑی کپڑے کی دُکان، وہاں دو دو منشی کام کرتے تھے، کیا دن تھے وہ بھی!" ابا نے لمبی ٹھنڈی آہ بھری۔ ساجدہ نے آنکھیں پھاڑ کر ابا کو دیکھا۔

"مجھے افسوس ہے رمضان صاحب! میں آپ کو منشی نہ دلا سکوں گا۔" وہ ہنسا "بہر حال یہ لیجئے کاغذات، اپنا کلیم لکھیے گا اور دو گواہوں کے دستخط کرا لیجئے گا۔"

ساجدہ نے غصّے سے تلملاتی ہوئی نظروں سے ناظم کو گھُورا اور پھر چند قدم سرک کر ابّا کے پاس آ کر کھڑی ہو گئی۔ وہ ناظم سے پُوچھنا چاہتی تھی کہ تم میں اتنی ہمت کہاں سے آ گئی کہ میرے ابا کا مذاق اڑاؤ۔ مگر وہ ایک لفظ نہ کہہ سکی۔ غصّے سے اس کے پاؤں کانپ رہے تھے۔

ابّا نے کاغذات الٹ پلٹ کر دیکھے "ایک گواہ کیا چار گواہوں کے دستخط کرا لوں گا۔"

"اچھا تو میں چلتا ہُوں، کل آؤں گا۔"

"بس آپ کی مہربانی چاہیے، بغیر گھر کے تو انسان بندر لگتا ہے۔"

ابّا جیسے اس کے سامنے گھگھیا رہے تھے۔

"آپ فکر نہ کریں، ایک دو دن میں آپ کو گھر مل جائے گا، بس ایک تالہ توڑا اور آپ کو گھر میں بٹھایا۔"

"کیا آپ تالے توڑنے کا کام کرتے ہیں؟" ساجدہ کی آواز کانپ رہی تھی۔ ابّا کے سامنے کسی غیر مرد سے بات کرنے کی پہلی بار جرأت کی تھی۔

"پہلا تالہ میں نے یہیں آ کر توڑا تھا۔" اس نے ساجدہ کی طرف دیکھے بغیر بہت سنجیدگی سے کہا۔ "اچھا خدا حافظ رمضان صاحب!" وہ بڑے سکون سے

نپے تُلے قدم اُٹھاتا چل دیا۔

"تم — تم — سجو بٹیا!" ابّا غصّے سے بولنے لگے "بھلا تم کو ایسی بات کہنی چاہیے تھی؟ مردوں کی بات چیت میں تمھیں دخل دینے کی کیا ضرورت تھی؟ ٹھیک ہے تم نے برقع اوڑھنا چھوڑ دیا، مگر اس کا یہ مطلب تو نہیں کہ ———

"ابّا! میں نے آخر ایسی کیا بات کہہ دی کہ آپ کو غصّہ آرہا ہے۔ وہ آپ کا مذاق اڑا رہا تھا مجھے غصّہ آگیا۔"

"وہ میرا مذاق اُڑا رہا تھا؟ مذاق تو تم اُڑا رہی تھیں۔ تمھاری زبان اور پاؤں دونوں کُھل گئے ہیں۔ آج صبح تم لوگوں کے ہجوم میں چائے لینے پہنچ گئیں، رات بوڑھے سے ہمدردی کرنے چلی گئیں اور ———

وہ سر جھکائے اندر چلی گئی۔ اسے اچھی طرح احساس تھا کہ ابّا آج پہلی بار حساب کتاب میں غلطی کر کے شرمندہ ہیں۔ وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ ابّا چند ہی لمحوں بعد اندر آگئے۔ اسے یوں روتے دیکھ کر وہ جیسے گھگھیانے لگے "کیوں رو رہی ہو بٹیا؟ میں نے تو تم کو کچھ نہیں کہا، کیا تم مجھ سے ناراض ہوگئی ہو بٹیا؟ مت رو، نہیں تو ———" ابّا کی آواز بھرّا گئی "میں بھی رونے لگوں گا۔"

ساجدہ نے جلدی سے آنسو پونچھ لئے "میں آپ کی بات پر نہیں رو رہی ابّا! بس یوں ہی جی بھر آیا تھا۔" اس نے بڑے انداز سے چہرہ اٹھا کر مسکراتے ہوئے ابّا کو دیکھا، ابّا کا چہرہ تمتمایا ہُوا تھا۔

"وہ بٹیا! بات یہ ہے کہ میں چاہتا ہوں تم سُکھی رہو، اور دیکھو نا! یہاں تو اپنی گلی محلّے کے بس دو چار ہی جاننے والے ہیں اور پھر ———" وہ ٹھنڈا حقّہ اُٹھا کر

گڑگڑانے لگے۔

"روٹی کھا لیجیے ابّا!" وہ برتن اُٹھانے لگی، وُہ چاہتی تھی کہ اب اس موضوع پر کوئی بات نہ ہو۔ ابّا کا شرمندہ چہرہ دیکھ دیکھ کر اُسے رحم آرہا تھا۔ دیانت داری کے ڈھنڈورے نے ساری زندگی انھیں چھوٹی سی تنخواہ کے سہارے زندہ رہنے پر مجبور رکھا۔ اور جب احساس ہوا کہ یہاں تو انھیں کوئی جانتا بھی نہیں تو انھوں نے ایک ہی ضرب میں ڈھنڈورے کے چمڑے کو پھاڑ دیا مگر اب اندھیرے خول کو دیکھ کر سر جھکائے بیٹھے تھے۔ "روٹی کھا لیجئے ابّا!" اس نے پھر کہا

"دے دو"۔ وہ جیسے سوچتے سوچتے چونک پڑے۔

"کب سے آپ کے سامنے رکھی ہے"۔ وہ ہنسنے لگی

"اچھّا اچھّا، میں نے دیکھا ہی نہیں، تھوڑی سی کھائے لیتا ہوں، پیٹ میں ہلکا ہلکا درد ہو رہا ہے"۔

"یہ بھوک کا درد ہوگا ابّا! دو نوالے کھاتے ہیں اور بس، دو کوڑی کی صحت نہیں رہ گئی، آج ڈاکٹر کے پاس ضرور جائیے گا"۔

برتن رکھنے کے بعد وہ اپنے بستر پر لیٹ گئی۔ وہ ابا کو اتنا کمزور دیکھ کر سخت پریشان تھی پھر وہ بھی تو ابھی تک نہیں آیا۔ شاید وہ کسی اور قافلے سے آرہا ہو، شاید ہوائی جہاز سے آگیا ہو۔ اگر وہ آجاتا تو ابا کو کسی اچھّے سے ڈاکٹر کو دکھاتی۔ پھر اُسے یاد آنے لگا کہ صلّو نے اس کے ہر دکھ درد کو بٹایا تھا۔ جب وہ دس گیارہ سال کی تھی اور اماں مرگئی تھیں۔ اور جب وہ گلی میں کھڑی اماں کی میّت کو جاتا دیکھ کر زور زور سے رو رہی تھی تو صلّو نے آکر اسے اپنے شانے سے لگا لیا تھا "مت رو مُنّی! مت رو"۔ وہ مردوں

کی طرح اسے چپ کرا رہا تھا اور وہ سچ مچ چپ ہو گئی تھی۔ صلّو اسے بہلانے کے لیے دن میں کئی بار اس کے پاس آتا۔ اسے چڑیلوں اور بھوتوں کی کہانیاں سناتا اور اسے یقین دلاتا کہ اس نے ایک بار اپنی آنکھوں سے پری دیکھی تھی۔ اسے کبھی یقین نہ آتا۔

"بھلا پریوں کو کیا پڑی ہے جو زمین پر آ بسیں۔" صلّو بگڑ کر چلا جاتا۔

جب وہ ساتویں کلاس میں پڑھتی تھی تو اس نے اماں کے دوپٹے نکال کر اوڑھنا شروع کر دیے اور بس اسی وقت سے ابا نے صلّو کو ڈانٹ دیا تھا کہ وہ اب گھر نہ آیا کرے۔ انھیں دنوں صلّو میٹرک کا امتحان دے کر گاؤں چلا گیا تھا، تب اسے محسوس ہوا تھا کہ وہ اس کے لئے بے چین ہے اس نے چھٹیوں کے دن گن گن کر کاٹے تھے۔

ابا دوا لے کر واپس آ گئے اور ایک خوراک پی کر بستر پر لیٹ گئے۔

"ابا! اب کیا حال ہے؟"

"بس ٹھیک ہوں بٹیا۔" انھوں نے کروٹ لے لی اور پیر اس طرح سمیٹ لیے کہ گھٹنے پیٹ میں اڑے ہوئے لگ رہے تھے۔

"میں سر دبا دوں ابا! ذرا دیر سو لیں گے تو طبیعت ٹھیک ہو جائے گی۔" وہ ابا کے سرہانے بیٹھ کر آہستہ آہستہ ان کا سر دبانے لگی تو انھوں نے آنکھیں بند کر لیں اور تھوڑی دیر بعد ہلکے ہلکے خراٹے لینے لگے۔

"دوا سے فائدہ تو ہوا ہے۔" ساجدہ نے اطمینان کی سانس لی۔ چند پیلے پیلے پتے ابا کے بستر پر گرے تو اسے احساس ہوا کہ خزاں کا دور شروع ہونے والا ہے۔

وہ ابا کے سرہانے سے اٹھ کر اپنے بستر پر آ گئی۔ دوپہر اسے بہت ویران لگ رہی تھی وہ اپنے بستر پر آنکھیں بند کر کے لیٹ گئی۔ اگر نیند آ جائے تو کتنا اچھا ہو۔ وہ سوچنے لگی۔

ایک ذرا دیر کے لیے انسان ساری فکروں سے چھٹکارا حاصل کر لیتا ہے۔ کوئی پکے پھل جیسا میٹھا خواب بھی دکھائی دے جاتا ہے۔ وہ صلاح الدین کو یاد کرنے لگی۔ ایک بار اس نے صلّو سے کہا تھا کہ اسے رات کو نیند نہیں آتی اور صلّو نے اسے بڑی حیرت سے دیکھا تھا "پھر تم مجھ سے محبت نہیں کرتیں سجو! محبت کے سائے ہیں تو انسان بڑی غفلت کی نیند سوتا ہے اسے پکے پھل جیسے میٹھے خواب دکھائی دیتے ہیں۔"

مگر آج جب وہ اسے یاد کرتے کرتے سو گئی تھی تو پکے پھل میں جیسے کیڑے پڑ گئے تھے۔ بُوڑھے کی چیخیں جانے کہاں سے سنائی دے رہی تھیں۔ پھر وہ بھی اس کے ساتھ چیخنے لگی۔

"کیا بات ہے بٹیا؟" ابّا بستر پر بیٹھے تھے اور اسے پریشان نظروں سے دیکھ رہے تھے۔

"کیا ہوا ابّا؟" وہ پسینے میں شرابور تھی۔

"کچھ نہیں، تم سو رہی تھیں اور تمھارے گلے سے عجیب سی آواز نکل رہی تھی جیسے تم چیخنا چاہ رہی تھیں۔ کیا کوئی ڈراؤنا خواب دیکھ رہی تھیں؟"

"ہاں ابّا! میں سفر کا خواب دیکھ رہی تھی۔ وہی جب اندھیری رات میں ٹرین پر حملہ ہُوا تھا۔" وہ جھُوٹ بول دی

"اب تو اپنے پاکستان میں ہو بٹیا! اب ان باتوں کو بھُول جاؤ۔" ابّا ہنسنے لگے "تمھاری امّاں، اللہ اسے جنّت نصیب کرے کبھی کسی بات سے ڈرتی نہیں تھی۔"

"اب آپ کا درد کیسا ہے؟" اسے ابّا کا چہرہ بہت پیلا نظر آ رہا تھا۔

"ٹھیک ہے، دوائی ایک خوراک اور دے دو۔ تمھاری امّاں ایک چوُرن بناتی تھیں

کبھی میرے پیٹ میں درد ہوتا تو ایک چٹکی کھلا دیتیں۔ بس اسی وقت ٹھیک ہو جاتا۔"
ابّا نے ٹھنڈی سانس بھری۔

دوا پلاتے ہوئے ساجدہ نے سوچا کہ آج ابّا کو اماں اتنی کیوں یاد آ رہی ہیں۔ وہ تو اس کے خیال سے کبھی اماں کا ذکر ہی نہ کرتے تھے۔

"ابّا! سچ سچ بتائیے آپ کو زیادہ تکلیف تو نہیں ہے؟"

"ارے نہیں۔" وہ کھڑے ہو گئے "میں ذرا ٹہل لوں تو ٹھیک ہو جاؤں گا، باہر رونق ہو گی، جی بہل جائے گا۔"

ابّا حقّہ اٹھا کر باہر چلے گئے تو وہ دونوں ہاتھ پھیلا کر دعا مانگنے لگی: "اے اللہ! تو ابّا کا ہر دکھ درد مجھے دے دے۔" اس نے اتنے خلوص سے دعا مانگی تھی کہ اسے اپنے دل کا بوجھ ہلکا ہوتا محسوس ہوا۔

وہ باہر نکل کر کھڑی ہو گئی۔ اب کیمپ میں خاصی گہما گہمی تھی۔ سرخی پوڈر سے لپی پتی چند بیگمات عورتوں سے ان کے دکھ درد پوچھتی پھر رہی تھیں۔ کچھ لوگوں کا سامان ریڑھوں پر رکھا جا رہا تھا۔ کچھ لوگ ایسے بھی تھے جن کے عزیز و اقربا ملنے آئے تھے۔ وہ گلے مل مل کر مسرّت کے آنسو بہا رہے تھے۔ ایک لڑکا اس کے پاس سے گاتا ہوا گزر گیا "بچھڑے ہوئے ملیں گے خالق نے گر ملا دیا۔"

جانے وہ کس سے ملنے کو بیتاب تھا۔ وہ کس کا انتظار کر رہا تھا۔ اس نے سوچا یہاں سب انتظار کی کیفیت میں مبتلا ہیں جیسے سب پلیٹ فارم پر ٹھہرے ہوئے ہیں۔ وہ بھی تو یہاں بیٹھی انتظار کر رہی ہے۔ وہ ابھی تک اسے ڈھونڈنے نہ آیا تھا۔

اس نے دیکھا، ابّا دُور سے ٹہلتے ہوئے چلے آرہے ہیں اور راستے میں رک رک کر لوگوں سے باتیں کرتے جارہے ہیں۔ انھیں کیمپ کی بظاہر نظر آنے والی ذرا ذرا سی بات کا علم رہتا۔ کتنے لوگ آئے ہیں، کتنے خاندان چلے گئے، کتنے جانے والے ہیں اور کون کہاں جارہا ہے۔ جانے والی بات سناتے ہُوئے ابّا کی آنکھوں میں چمک آجاتی "ایک دن ہم بھی چلے جائیں گے، بہت جلدی، سُنا تم نے بٹیا؟ کوئی ہم سدا تو یہاں نہیں رہیں گے!"

اب سُورج ڈھل گیا تھا۔ بسیرا لینے والے پرندے درختوں پر شور مچا رہے تھے۔ وہ ایک دم اداس ہوگئی، بیگمات اب واپس جارہی تھیں اور کھانے کی دیگیں ریڑھے پر سے اتاری جارہی تھیں۔ بجلی کے کھمبوں پر کم پاور کے بلب پکے پھوڑوں کی طرح چمک اُٹھے۔ اس نے دیکھا کہ ابّا اس کی طرف آرہے ہیں۔ مگر اب وہ کچھ اس طرح چل رہے تھے جیسے خود کو گھسیٹ رہے ہوں۔ وُہ لپک کر ابّا کے پاس پہنچ گئی تو انھوں نے اپنا ہاتھ اس کے شانے پر رکھ دیا۔

"ابّا! آپ کی طبیعت ٹھیک تو ہے نا؟"

"ٹھیک ہوں بٹیا! بالکل ٹھیک ہُوں۔ لوگ کہہ رہے ہیں آج گوشت کی دیگیں

آ گئی ہیں، تم لپک کر برتن تو اٹھا لاؤ بٹیا"۔

"آپ اندر چل کر لیٹئے، کھانا آ ہی جائے گا"۔

"ارے نہیں بٹیا! تم دیکھتیں نہیں لوگ کس طرح دیگوں پر ٹوٹے پڑتے ہیں"۔ وہ ہلنسے لگے "ساری بوٹیاں ختم ہو جائیں گی، تم میرے آرام کی خاطر بھوکی رہ جاؤ گی سالن کی خوشبو آ رہی ہے نا!" انھوں نے ساجدہ کے شانے سے ہاتھ ہٹا لیا مگر ہاتھ ہٹاتے ہی وہ پیٹ پکڑ کر اس طرح جھک گئے جیسے گر پڑیں گے۔

"بھاڑ میں جائے کھانا، آپ اندر چلیے"۔ جب وہ ابا کو سہارا دے کر اندر لا رہی تھی تو اس نے محسوس کیا کہ ان کے پاؤں کانپ رہے ہیں۔

ابا کو لٹا کر اس نے دوا کی شیشی اٹھائی تو انھوں نے ہاتھ کے اشارے سے منع کر دیا۔

"کیوں ابا؟"

"اس دوا سے فائدہ نہیں ہو رہا، ڈاکٹر سے کہو کہ ——————" ابا نے ہونٹ بھلینچ لیے۔

"میں ڈاکٹر کے پاس جاتی ہوں ابا! میں اسے ابھی لاتی ہوں"۔ وہ باہر نکل کر پوری طاقت سے بھاگنے لگی۔ اس نے یہ بھی نہ سنا کہ ابا اسے پکار رہے تھے "رک جاؤ بٹیا! پہلے کھانا لے آؤ، لوٹ آؤ بٹیا! میں ٹھیک ہوں"۔

ڈسپنسری تک پہنچتے پہنچتے اس کی سانس پھول گئی۔ اسٹول پر بیٹھا ہوا کمپونڈر بڑے مزے سے نان کے ساتھ بوٹیاں کھا رہا تھا۔ جب وہ ڈسپنسری کے اندر جانے لگی تو اس نے ہاتھ کے اشارے سے روک دیا۔

"ڈاکٹر صاحب واک کے لیے گئے ہیں بی بی!" نوالہ نگلنے کے بعد اس نے بتایا

"کب آئیں گے؟"

"آجائیں گے بی بی! اب دیکھو نا۔ جب تک بندہ ٹہلے نہیں، روٹی کیسے ہضم ہو! بس آتے ہی ہوں گے۔"

"میرے ابا بہت بیمار ہیں"۔ وہ کمپونڈر کو التجا سے دیکھنے لگی۔ "جب ڈاکٹر صاحب آئیں تو ان سے کہنا منشی رمضان صاحب کو آکر دیکھ لیں"۔ یہ پیغام اس نے بالکل اسی طرح دیا جیسے ایک بار رات کو وہ اپنی گلی میں رہنے والے ڈاکٹر کو دے آئی تھی۔ اس رات بھی ابا کے پیٹ میں سخت درد اٹھا تھا۔ ڈاکٹر چند منٹ بعد آگیا تھا اور اس نے کہا تھا کہ آپریشن کرا کے اپینڈکس نکلوا دیں۔ ڈاکٹر کے جانے کے بعد ابا بہت ہنسے تھے "کل کو ڈاکٹر صاحب کہیں گے کہ پیٹ ہی بدلوا لو۔" ساجدہ نے کیسا کیسا سمجھایا مگر ابا تو آپریشن کی بات ہی سننے کو تیار نہ تھے۔ باپ کی کم علمی بعض وقت اسے خون کے آنسو رلاتی۔

وہ چند منٹ تک کھڑی ڈاکٹر کا انتظار کرتی رہی اور پھر یہ سوچ کر دوڑ پڑی کہ ابا اکیلے ہیں مگر جب وہ ابا کے پاس پہنچی تو وہ اکیلے نہیں تھے، ان کے پاس بہت سے لوگ جمع تھے اور ڈاکٹر بھی سر جھکائے خاموش کھڑا تھا۔ ساجدہ کو دیکھ کر لوگ ابا کے پاس سے ہٹ گئے۔ ابا کے سرہانے رکھی ہوئی لالٹین ٹمٹما رہی تھی۔

"آپ یہاں ہیں میں آپ کو ڈسپنسری میں تلاش کر رہی تھی۔ اب ابا کی طبیعت کیسی ہے؟" وہ ڈاکٹر کو امید بھری نظروں سے دیکھ رہی تھی "ابا ٹھیک ہیں نا، آپ کو کس نے بتایا کہ میرے ابا بیمار ہیں؟"

"میں نے ان کو ادھر سے گزرتے دیکھا تو بُلا لیا تھا"۔ ایک بزرگ سے آدمی نے بھرائی ہُوئی آواز میں جواب دیا۔

"میں پُوچھ رہی ہوں میرے ابّا کیسے ہیں؟" وہ تقریباً چیخ پڑی۔ سب خاموش رہے، کسی نے کوئی جواب نہ دیا۔

"میں ڈیوٹی پہ تھا، اگر میں گھومنے نہ گیا ہوتا تو ——" اس نے ساجدہ کی وحشت زدہ آنکھوں میں جھانک کر سر جھکا لیا "مجھے اپنے جُرم کا احساس ہے"۔

"اللہ کی مرضی، اللہ کی مرضی"۔ کئی آوازوں نے ایک ساتھ کہا۔ تب اسے احساس ہوا کہ ابّا مر گئے اور اس احساس کے ساتھ ہی وہ سر سے پاؤں تک سُن پڑ گئی۔ اس نے ڈاکٹر کو جاتے دیکھا، لوگوں کو ہٹتے دیکھا، پھر وہ ایک کمزور شاخ کی طرح جھُکنے لگی، تو کئی ہاتھوں نے اُسے تھام لیا۔

جب وہ ہوش میں آئی تو اس نے دیکھا کہ ادھیڑ عمر کی عورتیں بیٹھے بیٹھے ایک دُوسرے کا سہارا لیے سو رہی تھیں اور دو سپارے ان کے سامنے کھُلے ہوئے تھے۔

وہ آہستہ سے اُٹھ کر بیٹھ گئی۔ اس نے ابّا کے چہرے سے چادر سرکا کر لالٹین کی بتی اونچی کر دی۔ سرد، اداس اور ویران چہرہ جیسے اس سے سرگوشی کر رہا تھا "ارے بٹیا! زندگی کے حساب میں بھی غلطی ہو گئی اب تم کیا کرو گی؟"

اس نے اپنا چہرہ ان کے ٹھنڈے چہرے پر رکھ دیا اور اس طرح گھُٹ گھُٹ کر رونے لگی کہ کہیں کوئی اس کے آنسوؤں کی آہٹ نہ سُن لے، کوئی اس کے غم کی راہ کو صبر کے لفظوں سے کھوٹا نہ کر دے۔

اور جب اس کے سر کو آہستہ سے کسی نے اٹھایا تو پو پھٹ چکی تھی اور دُور سے اذان کی آواز آ رہی تھی۔

عورتوں نے اس سے نہ جانے کتنے بہت سے سوال کر ڈالے تھے "تمھارا کوئی عزیز ہے کہ نہیں؟ —— اب تم کس کے پاس رہو گی؟ —— اب تم کہاں جاؤ گی؟"

وہ ان کے ہر سوال پر انکار میں گردن ہلا دیتی۔

"کوئی نہیں تو پھر کیا ہوا، کیا ہم مر گئے ہیں!" ایک عورت نے بڑی ہماہمی سے کہا

"میرے ہوتے ہُوئے تم اکیلی نہیں ہو۔" دوسری عورت نے اس کے سر پر ہاتھ رکھ دیا تو اسے ایسا لگا جیسے ایک مضبوط ہاتھ اسے تھپک رہا ہے "مت رو مُنّی! مت رو سجّو۔" احساس کی محرومیت پر وُہ بری طرح تڑپ گئی۔ اس کا جی چاہ رہا تھا کہ وہ زور زور سے چیخے "ابا مر گئے صلّو!" اس نے عورت کا ہاتھ آہستہ سے ہٹا دیا۔

اب سُورج کی کرنیں چادر کے کھسکے ہوئے کونے سے اندر جھانک رہی تھیں۔ اس نے دیکھا کہ چائے اور کھانے کی دیگیں ریڑھے پر سے اتاری جا رہی ہیں۔ پھر اس نے غلام محمد کی آواز سُنی "گرم چائے، چائے پیو بادشاہو چائے۔"

پھر وُہ بچّوں کے بیچ میں ناچنے لگا: "چائے پیو گرم گرم نان کھاؤ نرم نرم۔"

ساجدہ نے دونوں ہاتھوں سے اپنے کان بند کر لیے، آج کی صبح کل کی صبح سے کتنی مختلف تھی۔ غلام محمد کی آواز آج اسے کتنی بُری لگ رہی تھی۔

کیمپ کے منتظم ایک کھاٹ اور چند آدمیوں کے ساتھ جب اس کے پاس آ کر

کھڑے ہو گئے تو وہ سب کچھ سمجھ گئی۔ "بیٹی!" کیمپ کا بزرگ منتظم کچھ کہتے کہتے چُپ ہو گیا۔

"ابا کا آخری لباس خریدنے کے لیے میرے پاس کچھ رُوپے ہیں۔" اس نے بے حد صبر سے صاف لہجے میں کہا

"میں صرف تم سے اجازت لینے آیا ہوں بیٹی! مجھے کچھ نہیں چاہیے۔ رمضان میرے بھائی تھے۔ غسل دینے کے بعد تم کو آخری دیدار کرا دوں گا۔"

انتہائی کوشش کے باوجود وہ بزرگ کو جواب نہ دے سکی۔ اس کے ہاتھ چھوٹے سے بکس کی طرف بڑھے اور پھر جیسے مفلوج ہو گئے اور وہ ابا کو کلمے پڑھتے ہُوئے اٹھا کر لے گئے۔

چادروں کی دیوار ایک طرف گر گئی تھی۔ دونوں عورتیں اس پر ہاتھ رکھے آہستہ آہستہ رو رہی تھیں مگر اس کی آنکھیں اب کورے پیالے کی طرح صاف تھیں۔ اب صرف تنہائی کا احساس اور مستقبل کا خیال اس کے سامنے کھڑا جیسے دھمکیاں دے رہا تھا۔

غلام محمد نے شاید میت اُٹھتے دیکھ لی تھی۔ بچّوں کے نرغے کو توڑ کر وہ ساجدہ کے پاس آ گیا تھا اور سر جھکائے چُپ چاپ کھڑا تھا۔

"جاؤ بیٹے! اپنا کام کرو۔" ایک عورت نے اس کی طرف مڑ کر کہا

"باجی! کیا آپ کے ابّا ———؟" غلام محمد بات پُوری نہ کر سکا

"ہاں گامُو! میرے ابّا مر گئے۔" وہ بڑی مشکل سے بولی اور پھر اس نے دیکھا کہ گامُو جیسے الھڑ لڑکے کی آنکھوں سے آنسو بہہ بہہ کر اس کے میلے گریبان میں جذب ہو رہے ہیں۔ گامُو کے آنسوؤں نے اس کے ضبط کے سارے بندھن توڑ دیے۔

"صبر کرو، مت رو۔" ایک عورت اسے سمجھا رہی تھی

"لو، بیچاری روئے نہ تو کیا کرے، کوئی رشتے ناطے کا بھی نہیں جو ساتھ

دے۔ ہائے ہائے کیسا قہر ٹوٹا ہے۔"

ساجدہ ایک دم چپ ہو گئی۔ ہمدردی کے یہ الفاظ اسے ہتھوڑے کی چوٹ لگ رہے تھے۔

"باجی! آپ میرے ساتھ چلیے، میری اماں ہیں، ہمارا چھوٹا سا گھر ہے، میری کوئی بہن نہیں، میں آپ کی خدمت کروں گا، میں آپ کو ——"

"ارے لڑکے! ذرا عقل کی بات کرو۔ ایک جوان لڑکی تمھارے ساتھ جائے گی تو دنیا کیا کہے گی!"

گامو بگڑا تھا "اجی چھوڑو، کیا کہے گی دنیا!"

"ماسی! یہ دنیا نہیں، پاکستان ہے پاکستان، اور یہ میری باجی ہیں، باجی۔"

"گامو!" وہ بہت پیار سے بولی "تم میری فکر نہ کرو، میں اپنی مدد آپ کر سکتی ہوں۔" اس نے بڑے اعتماد سے کہا "جاؤ! لوگ چائے کا انتظار کر رہے ہوں گے جائے پیو گرم گرم، روٹی کھاؤ نرم نرم۔" وہ بازوؤں میں سر چھپا کر آنسو پونچھنے لگی۔

اس نے گامو کے سسکنے کی آواز سنی اور جب اس نے سر اٹھایا تو وہ جا چکا تھا۔

دنیا اور پاکستان سب اس کے ذہن میں گڈمڈ ہو کر رہ گئے۔

زندگی کے خاتمے کے تمام مراحل گزر چکے تھے۔ اور اب شام ہو رہی تھی۔ بادلوں کے چند سیاہ ٹکڑے ہوا میں جیسے دوڑے جا رہے تھے اور بسیرا لینے والے پرند درخت پر شور مچا رہے تھے۔ پرندوں کی سیٹیوں جیسی آوازیں آج اس کی زندگی میں کوئی امنگ پیدا نہ کر رہی تھیں۔ اسے لگ رہا تھا کہ ہر آواز اس کے کانوں میں درد کی ٹیس بن رہی ہے۔

دونوں عورتیں تھوڑی دیر کے لیے اٹھ کر گئیں اور پھر آگئیں۔ اس وقت وہ دونوں اس کے مستقبل کے لیے بڑی فکر مند نظر آ رہی تھیں۔

"میں کہتی ہوں کہ میرا دیور اتنا اچھا لڑکا ہے کہ بس کچھ نہ پوچھو، ہر ایک تعریف کرتا ہے۔ کانپور میں زیوروں کی بہت بڑی دُکان تھی سب لُٹ گئی۔ خیر دُکان تو یہاں بھی مل جائے گی۔ تیس چالیس سیر سونا تو کپڑوں میں چھپا کر نکال لائے ہیں" سُنار کی بھاوج نے چند لفظوں میں ساری رام کہانی سُنا دی۔

"اور میرا بھائی ماشاءاللہ بارہ جماعتیں پڑھا ہوا ہے، وہاں جلسے جلوسوں میں پڑ گیا۔ کہتا تھا کہ اب تو پاکستان جا کر ہی پڑھوں گا۔ میں تو کہتی ہوں پاکستان کے لیے اس نے رات دن ایک کر دئے۔ سچ پوچھو بہن! تو پاکستان بنایا اسی نے، اللہ اس کی لمبی عمر کرے، صُورت شکل ایسی کہ دیکھے سے بھوک پیاس اڑے۔"

ساجدہ نے آنکھیں پھاڑ کر دونوں عورتوں کو دیکھا تو اسے دو جونکیں نظر آئیں، بالکل ویسی ہی جونکیں جنھیں ایک بار حکیم نے اماں کے پیروں میں چپکا دیا تھا اور جب وہ اماں کا خون چُوس چُوس کر پھُول رہی تھیں تو وہ مارے ڈر کے باہر بھاگ گئی تھی۔ مگر یہ جونکیں تو ان سے زیادہ خطرناک تھیں وہ اس کی خود اعتمادی کی دیوار کو ڈھا رہی تھیں۔

بچپن میں اماں اسے ایک کہانی سُنایا کرتی تھیں، ایک تھا بادشاہ ہمارا تمہارا خدا بادشاہ ۔ تو بیٹا اس بادشاہ کی سات بیٹیاں تھیں ۔ ایک بار بادشاہ نے اپنی ساتوں بیٹیوں کو اپنے پاس بلایا اور باری باری سب سے پُوچھا کہ تم کس کی قسمت کا رزق کھاتی ہو ۔ چھ بیٹیوں نے کہا کہ ابّا حضور! ہم آپ کی قسمت کا رزق کھاتے ہیں ۔ مگر سب سے چھوٹی بیٹی نے کہا کہ ابّا حضور! میں اپنی قسمت کا لکھا کھاتی ہُوں ۔ بادشاہ چھوٹی بیٹی سے ناراض ہو گیا اور اس نے خادموں کو حکم دیا کہ چھوٹی بیٹی کو ڈولے میں بٹھا کر جنگل بیابان میں چھوڑ دیا جائے ۔ چھوٹی بیٹی جنگل میں حیران پریشان پھرتی تھی، نہ کھانے کو روٹی تھی نہ پینے کو پانی، پھر خدا کا کرنا کچھ ایسا ہوا کہ چھوٹی شہزادی کو وہیں خزانہ ملا اور اس خزانے سے اس نے ایک بہت بڑا محل تعمیر کرایا اور ———

خود اعتمادی کی یہ کہانی ختم بھی نہ ہوتی کہ ساجدہ بول پڑتی "اماں! میں سب سے چھوٹی بیٹی ہُوں"۔ اسے چھوٹی بیٹی سے بہت محبت ہو گئی تھی اور یہی وجہ تھی کہ اماں کے مرنے کے بعد اس نے چھوٹی عمر میں گھر سنبھال کر ابّا کو بہت سی فکروں سے آزاد کر دیا تھا ۔ مگر ابّا اسے تنہائی کے جس ڈولے میں بٹھا کر انسانوں کے جنگل میں

چھوڑ گئے تھے وہاں وہ خود اعتمادی کا خزانہ کھودنے کی طاقت کھو بیٹھی تھی۔

"بہن! تمھارے پاس تو اتنا بھی نہیں کہ کیمپ سے نکل کر دو وقت کی روٹی کھا سکو" سُنار کی بھاوج فخر سے کہہ رہی تھی "علم کو چاٹنے سے پیٹ تو نہیں بھر جاتا۔"

"واہ جی وا" —— پاکستان بنانے والے کی بہن کو تاؤ آگیا" سونے میں کھوٹ ملا ملا کر چار پیسے کما لیے تو ہمارے منہ لگتی ہو؟ ٹھیک کہتا ہے میرا بھائی، جاہلوں سے اس طرح بھاگو جیسے کمان سے تیر۔"

"ذرا میں دیکھوں تمھارا تیر کمان۔" سنار کی بھاوج نے آستین چڑھا کر ہاتھ لہرایا تو ساجدہ آنکھیں بند کیے زور سے چیخی: "ابّا" —— اور پھر چیختی چلی گئی" ابّا۔ ابّا۔"

دونوں عورتیں گھبرا کر اسے تسلّی دینے لگیں۔

"ہم نے تو کچھ نہیں کہا، خدا کے لیے چپ ہو جاؤ۔"

"ہم نے کچھ نہیں کہا، مرضی کے بغیر کچھ نہیں ہوتا، کوئی ہم ضد کر رہے ہیں۔ ہم نے سوچا بیچاری بے سہارا ہے کہاں جائے گی۔"

اس نے جیسے کچھ نہیں سُنا، بس وہ چیخ چیخ کر روئے جا رہی تھی۔ پھر اسے احساس ہُوا کہ اس کے پاس ایک ہجوم جمع ہو گیا ہے۔ پھر اس نے اپنے سر پر ایک نرم نرم سا ہاتھ محسوس کیا تو وہ خاموش ہو گئی اور آنکھیں کھول کر اس نرم ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھ دیا۔ ہجوم میں گھری ہُوئی ایک موٹی موٹی آنکھوں والی سادہ سی لڑکی نے اسے کھینچ کر اپنے سینے سے لگا لیا۔ بادشاہ کی سب سے چھوٹی شہزادی کی طرح اسے محسوس ہُوا کہ اس نے خزانے کا سراغ پا لیا ہے۔

"مجھے سب معلوم ہے، اب تم اکیلی نہیں ہو۔" لڑکی اسے اس طرح لپٹا رہی تھی جیسے اپنے سینے میں سمو لے گی "اب تم میرے ساتھ چلو گی سجو!"

اس نے حیرت سے اپنا نام سُنا اور لڑکی کو سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگی "تم کون ہو، تم کیا ہو، مجھے کہاں لے جاؤ گی؟"

لڑکی ان سوالیہ نظروں کو بڑے پیار سے دیکھ رہی تھی اور جیسے ان سوالوں کو سمجھنے کی کوشش کر رہی تھی۔

"میں ان کو جانتا ہوں بیٹی! تم اطمینان سے ان کے ساتھ چلی جاؤ۔ تم اکیلی ہو۔ یہ تم کو سہارا دیں گی۔" لڑکی کے ساتھ کیمپ کے بزرگ منتظم کھڑے تھے۔

"مگر میں ——" اس کی نظر ستار کی بھاوج پر پڑی تو جیسے اس نے سہم کر اپنا سر لڑکی کے کاندھے پر رکھ دیا۔

"آپ رخصت ہوں بیٹی! میں سامان لے چلتا ہوں۔" منتظم کی آواز بھرائی ہوئی تھی۔

لڑکی اسے لپٹائے آگے بڑھ گئی۔ اس نے ایک بار مُڑ کر گھنے درخت کو دیکھا وہ اسے خزاں میں لُٹا ہُوا ٹُنڈ مُنڈ نظر آ رہا تھا —— عورتیں، مرد اور بچے سب اسے جاتا ہوا دیکھ رہے تھے۔ وہ سب جیسے اُسے خدا حافظ کہہ رہے تھے۔

پُرانی لمبی کار میں پچھلی سیٹ پر وہ لڑکی کی گود میں مُنہ چھپائے نڈھال سی پڑی تھی اور ناہموار سڑک پر تیز چلتی ہوئی کار بیحد شور مچا رہی تھی تو لڑکی نے اس کے سر پہ ہاتھ پھیرتے ہوئے آہستہ سے پکارا:

"ناظم بھائی! گاڑی آہستہ چلاؤ کوئی حادثہ نہ کر بیٹھنا۔"

ساجدہ نے جھٹکے سے سر اُٹھایا۔ جس خزانے کا سراغ پایا تھا اس پر تو ناگ بیٹھا تھا۔ اس کا جی چاہا کہ چلتی کار سے کُود جائے، بھاگ جائے۔ اس نے بےبسی سے لڑکی کو دیکھا۔

"لیٹی رہو، رو رو کر سر میں درد ہو رہا ہو گا۔" لڑکی نے پیار سے اس کا سر اپنے کندھے سے ٹکا لیا تو وہ سسک کر رو پڑی، وہ اس کے ساتھ جا رہی ہے جس نے اس کے باپ کا مذاق اڑایا تھا اور جس نے پاکستان آ کر پہلا تالہ توڑا تھا۔

"تم انھیں تسلّی بھی نہیں دے سکتیں سلیمہ! میں اناڑی ڈرائیور ہوں، کہیں واقعی حادثہ نہ کر بیٹھوں۔" ناظم نے کار کی رفتار اور تیز کر دی "میرا بھائی کار کو غائب پا کر سخت برہم ہو گا۔"

آنسو پونچھ کر وہ بند شیشے سے باہر دیکھنے لگی۔ درختوں سے لدی پھندی سڑک پر کہیں روشنی نہ تھی بادلوں نے اور بھی اندھیرا کر رکھا تھا۔ اور اب وہ سوچ رہی تھی کہ آئندہ کیا ہو گا۔ اس سوال کا جواب نہ پا کر اس کا دل بیٹھنے لگا اس کا جی چاہا کہ وہ اتنے زور زور سے چیخے کہ اس کی آواز صلاح الدین تک پہنچ جائے مگر اس نے اپنی اس خواہش کو ہونٹ بھینچ کر سینے میں دفن کر لیا۔ بےبسی اور خطرے کے احساس کے ساتھ انسان کیسی کیسی انہونی باتیں سوچنے لگتا ہے۔ اس نے بھی سوچا کہ صلو کیمپ میں ضرور آئے گا۔ جب اسے نہ پائے گا تو لوگوں سے پُوچھے گا، بُوڑھے منتظم سے ملے گا، اس سے پتا معلوم کر لے گا۔

اندھیرا راستہ ختم ہو گیا تھا۔ اب سڑک کے دونوں طرف بجلی کے کھمبے روشن تھے۔ کار ایک کوٹھی کے پھاٹک میں داخل ہو کر پورچ میں کھڑی ہو گئی تو اس نے

تیز روشنی میں دیکھا کہ کوٹھی کا رنگ و روغن اڑا ہوا تھا وہ بیحد پرانی لگ رہی تھی۔ لان کے چاروں طرف اونچے اونچے درخت گزرے ہوئے برسوں کا پتا بتا رہے تھے۔ ہوا میں دیسی گلابوں کی مہک رچی ہوئی تھی۔

کار سے اترتے ہی اسے خوشبو کے ساتھ سردی کا ایسا احساس ہوا کہ وہ کانپنے لگی ناظم کار سے اترتے ہی غائب ہو گیا۔ سلیمہ اس کا ٹھنڈا ہاتھ تھام کر بڑے دروازے سے اندر داخل ہو گئی۔ گیلری میں بچھی ہوئی دبیز قالین پر چلتے ہوئے اسے محسوس ہوا کہ اس کے پاؤں دھنس رہے ہیں۔ وہ ایک لمحے کو کھڑی ہو گئی۔

"کیا بات ہے سجو؟"

"میں تھک گئی ہوں۔" ساجدہ نے آہستہ سے کہا

"بس اتنا سا چل کر تھک گئیں؟" وہ مسکرا دی

"میں تو بہت دور سے سفر کر کے آ رہی ہوں باجی!" ساجدہ کی آواز بھرا گئی۔ اسی لمحے اسے کمرے کے کھلے ہوئے دروازوں سے ایک سریلی آواز سنائی دی "تم نے گھر کو خیرات خانہ سمجھ رکھا ہے تم کو یہ بھی خیال نہیں کہ اب تمہارے باپ کتنے تھک چکے ہیں۔ پہلے تمہاری ماں گھر کے کام کے بہانے تاجی کو اٹھا لائیں اور اب تم —— تمھیں پتا ہے کہ آٹا کتنا مہنگا ہو رہا ہے؟"

"کیا آپ آہستہ نہیں بول سکتیں۔ آپ ایک شخص پر حکومت کرتے کرتے یہ کیوں سمجھنے لگیں کہ سب آپ کے غلام ہیں۔" یہ ناظم کی آواز تھی۔ سلیمہ جیسے ساجدہ کو گھسیٹنے لگی "تم بہت تھک چکی ہو سجو! جلدی سے چلو، تم اپنے کمرے میں ذرا دیر آرام کرو گی تو تھکن دور ہو جائے گی۔"

دبیز قالین، خیرات خانہ، مہنگا آٹا۔ یہ کون سی جگہ ہے اللہ! یہ ساری چیزیں ایک جگہ کیسے جمع ہو گئیں۔

"سلیمہ بیٹی! کہاں ہو میری جان؟" اب وہ سریلی آواز گیلری میں گونجی۔

"آتی ہوں امی!" سلیمہ نے مڑ کر جواب دیا اور ایک چھوٹے سے اجاڑ کمرے میں داخل ہو گئی، جہاں ایک رنگین پایوں والا نواڑی پلنگ اسے آرام کی دعوت دے رہا تھا۔

"سلیمہ باجی!" ساجدہ خالی خالی نظروں سے سلیمہ کو دیکھنے لگی۔

"تم آرام کرو سجو! تاجی ابھی تمہارے لیے چائے بنا دے گی۔ صبح تمہارا کمرہ صاف کر کے تمہارا سامان لے آئے گی۔ کھانے کے وقت میں آ کر تم کو لے جاؤں گی پھر تم کو سب سے ملاؤں گی۔ ایں نا؟" سلیمہ اسے معصوم معصوم نظروں سے دیکھ کر مسکراتی ہوئی چلی گئی۔ اب بادل آہستہ آہستہ گرج رہے تھے اور کھلی ہوئی کھڑکی سے ہوا کے تیز جھونکے اندر آ رہے تھے۔ اس نے اٹھ کر کھڑکی بند کر دی اور پلنگ پر پاؤں لٹکا کر بیٹھ گئی۔ درد کے مارے اس کا سر جیسے پھٹا جا رہا تھا۔ اس وقت اس کے سوچنے سمجھنے کی ساری صلاحیت ایک کراہ بن کر رہ گئی تھی۔

"لو، چائے پی لو، اور یہ رہا تمہارا بستر۔" لڑکی نے بستر پلنگ پر رکھ دیا اور چائے کی پیالی اس کے ہاتھ میں تھما دی۔

"تم تاجی ہو؟" ساجدہ نے لمبی چوڑی لڑکی کو ذرا غور سے دیکھا۔ بھدے نقوش کے باوجود وہ بے حد معصوم لگ رہی تھی۔

"ہاں، میں تاجی ہوں۔" وہ مسکرائی "اچھا ہوا تم آ گئیں۔ اتنے بڑے گھر کا کام

اکیلے کر کر تھک جاتی تھی۔"

"تاجی! سلیمہ باجی سے کہنا کہ میں کھانا نہیں کھاؤں گی، اچھا! کہہ ضرور دینا، خواہ مخواہ وُہ مجھے بلانے آئیں گی۔"

"ارے واہ!" تاجی زور سے ہنسی

"ہنسنے کی کیا بات ہے؟" ساجدہ نے اسے غصّے سے دیکھا تو وُہ چُپ ہو گئی۔

"پیالی خود لے آنا، میں جاتی ہُوں۔" تاجی نے بھی اسے غصّے سے دیکھا اور چلی گئی۔ ساجدہ نے اُٹھ کر دروازہ بند کر کے چٹخنی لگا دی۔ اُلٹا سیدھا بستر بچھایا، روشنی گل کر کے لیٹ گئی اور درد کی شدت سے کراہتے کراہتے کب سو گئی اسے پتا بھی نہ چلا۔

صبح تڑکے اس کی آنکھ کُھل گئی۔ کمرہ اتنا اُجاڑ اور سنسان تھا کہ اسے ویرانے کا احساس ہونے لگا۔ ہر طرف لمبے لمبے بھورے جالے لٹک رہے تھے۔ دروازے اور کھڑکی کے شیشوں پر خاک سو رہی تھی اور دیوار میں بنے ہوئے بڑے سے طاق کے رنگین نقش و نگار مٹّی کی تہوں سے مرجھا گئے تھے۔ چند ٹوٹے ہوئے مٹّی کے دیئے فرش پر بکھرے ہُوئے تھے ان کی ادھ جلی بتّیاں لمبے بھورے کیڑوں کی طرح لگ رہی تھیں۔ ایسا محسوس ہوتا تھا کہ کمرے کو انسانی ہاتھوں نے بہت عرصے سے نہیں چُھوا۔

وہ بستر سے اُکتا کر کھڑی ہو گئی مگر اب اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کرے۔ اس نے آگے بڑھ کر بس یوں ہی کھڑکی کھول دی اور باہر جھانکنے لگی اُجاڑ لان میں کوئی تیزی کے ساتھ اس طرح چل رہا تھا جیسے دوڑ رہا ہو۔ آدمی کے کھچڑی بال دیکھ کر اسے ابّا یاد آ گئے، وہ بھی اسی طرح ٹہلا کرتے تھے۔ فرق صرف اتنا تھا کہ وہ گلیوں میں ٹہلتے تھے اور یہاں لان تھا۔ اس نے دُکھے دل سے سوچا کہ کہیں اس شخص کو بھی پیٹ کا کوئی مرض نہ ہو۔

آنسوؤں کی دُھند میں اس نے اپنے ابّا کو ٹہلتے دیکھا اور پھر کھڑکی سے سر

ٹیک دیا۔

کوئی دروازہ کھٹکھٹا رہا تھا۔

"کون ہے؟"

"میں تاجی ہوں جی۔"

اس نے آنسو پونچھ کر دروازہ کھول دیا۔ تاجی بیحد ہشاش بشاش کمر پر ہاتھ رکھے اس کے سامنے کھڑی مسکرا رہی تھی۔

"کیا ہے تاجی؟"

وہ اس کی مسکراہٹ سے چڑ رہی تھی۔

"کیا آپ بالوں سے کمرہ صاف کر رہی تھیں؟" وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی "ڈھیر سی مٹّی آپ کے بالوں میں بھری ہے۔"

ساجدہ نے ساری کے پلّو سے بال پونچھ ڈالے اور کھسیانی سی ہنسی ہنس پڑی "غسلخانہ کہاں ہے تاجی؟"

" نوکروں کے کوارٹر کے ساتھ بڑا اچھا غسل خانہ ہے، نہائیں گی تو مزہ آجائے گا، مگر ایک بات ہے، پہلے میرے ساتھ چل کر ناشتہ پکوالیں پھر نہانا دھونا ہوگا۔" تاجی اتنی سنجیدہ تھی کہ ایک لمحے کو وہ چکرا کر رہ گئی۔

"تاجی! تمھارا خیال ہے کہ میں یہاں ماماگیری کرنے آئی ہوں!" اس نے غصّے پر قابو پاتے ہوئے آہستہ سے کہا "مجھے سلیمہ باجی اپنی بہن بنا کر لائی ہیں۔ کیا سمجھیں تم؟"

"واہ جی وا!" تاجی بے ساختہ ہنسی اور پھر ایک دم سنجیدہ ہوگئی "بڑی

بیگم جب مجھے کیمپ سے لائی تھیں تو انھوں نے یہی کہا تھا کہ میں تجھے اپنی بیٹی بنا کر رکھوں گی، میری کوئی بیٹی نہیں ہے۔ میں ان کو اماں کہتی تھی، مگر ہوا کیا، سلیمہ باجی کی امّاں نے مجھے اس گھر کی نوکرانی بنا دیا۔ تنخواہ میں صرف روٹی کپڑا۔ مجھے بیٹی بنانے والی چپ چاپ یہ سب کچھ دیکھ رہی ہے۔ میں بھی اب انھیں امّاں نہیں کہتی۔" تاجی کی نظروں میں انتقام کی کوئی ننھّی سی چنگاری بھڑکی اور بجھ گئی۔ وہ پھر ہنسنے لگی "اب چلیں میرے ساتھ، زیادہ نخرے نہ کریں۔" تاجی نے بے تکلّفی سے ساجدہ کا ہاتھ پکڑ کر کھینچا۔

"نکل جاؤ میرے کمرے سے" —— ساجدہ وحشت سے چیخی۔ "مجھے نوکرانی بنانے والے ابھی پیدا نہیں ہوئے۔ میں یہاں سے چلی جاؤں گی۔ کہاں ہیں وہ سلیمہ باجی، میں ان سے پوچھوں گی۔ جاؤ، انھیں بلا کر لاؤ" —— وہ سر سے پاؤں تک کانپ رہی تھی، اور سہمی ہوئی تاجی اسے ڈری ڈری نظروں سے دیکھ رہی تھی۔

"کیا بات ہے سجو! تم کیوں چیخ رہی تھیں؟" سلیمہ شاید بھاگتی ہوئی آئی تھی اسی لیے اس کی سانس پھول رہی تھی "کیا ہوا ہے میری جان؟" اس نے کانپتی ہوئی ساجدہ کو زور سے لپٹا لیا "تاجی! تم نے کوئی بدتمیزی کی ہے؟ تم اب بہت سر چڑھ گئی ہو۔"

"میں نے تو بس اتنا کہا تھا کہ میرے ساتھ چل کر ناشتہ پکوا لیں۔ بس اتنی سی بات پر چیخنے لگیں۔" اس کی آواز بھرّا گئی —— "مجھ سے تو ہر وقت سب لوگ کام کراتے ہیں، میں کبھی نہیں چیختی —— کبھی ——" اس کا

چہرہ تانبے کی طرح سُرخ ہو گیا۔

ساجدہ کو اُس کے سچ پر پیار آگیا۔ "سچی بات یہ ہے کہ تاجی نے تو ایک ایمان داری کی بات کی تھی۔ میں یُوں ہی چیخنے لگی۔"

"بے وقوف، بدتمیز" —— سلیمہ کو غصّہ آگیا "تاجی! اگر آئندہ تم نے ایسی باتیں کیں تو یاد رکھنا" ہاں —— یہ تمھاری ساجدہ باجی ہیں، یہ تمھاری جیسی نہیں ہیں، یہ بہت پڑھی لکھی ہیں، کیا سمجھیں، یہ میری طرح ہیں۔"

"جی!" تاجی نے کچھ ایسی نظروں سے ساجدہ کی طرف دیکھا جن میں شکوک کی ایک دُنیا آباد تھی۔

"چلو، جلدی سے ناشتہ تیار کرو۔ دیر ہو گئی تو مالک ناراض ہوں گے۔"

تاجی سر جھکائے خاموشی سے چلی گئی۔ تو سلیمہ نے اطمینان کی لمبی سانس لی" بس دیوانی جیسی ہے، سجّو! تم اس کی باتوں کی پروا نہ کیا کرو۔ اب چلو میں تم کو اپنا غسل خانہ دکھا دُوں، تمھارے کپڑے کتنے مَیلے ہو رہے ہیں، تم آج میری ساری باندھ لینا، دوپہر کے کھانے کے بعد تاجی تمھارا کمرہ صاف کرے گی، پھر تمھارا سامان لا کر قاعدے سے لگا دے گی۔ ٹھیک ہے نا؟" اس نے پیار سے ساجدہ کی کمر میں ہاتھ ڈال دیا۔

مگر جب ساجدہ سلیمہ کے ساتھ جا رہی تھی تو اسے ایسا محسوس ہوا کہ وہ خود نہیں چل رہی۔ اگر سلیمہ اپنا ہاتھ ہٹا لے تو وہ دھڑام سے گر جائے گی۔ اس کے جسم کی کپکپی اب تک نہیں گئی تھی۔ تاجی کی باتیں اب تک اس کا کلیجہ نوچ رہی تھیں۔

"سلیمہ باجی! ——"

"ہاں — کیا ہے؟"

"آپ ——— ؟" ساجدہ سے بولا نہ جا رہا تھا۔

"کہو بھی نا؟"

"آپ مجھے یہاں کیوں لائی ہیں — آخر کیوں؟"

"ارے، بس، اتنی سی بات پوچھنا تھی، تم یہاں اسی لیے آئی ہو کہ تمھارا مستقبل محفوظ ہو جائے۔ ناظم بھائی کہتے تھے کہ تم جو کچھ کرنا چاہو گی، تم جو کچھ بننا چاہو گی وہ ہر طرح تمھاری مدد کریں گے۔"

"وہ میری مدد کریں گے؟" ساجدہ طنزیہ ہنسی مگر سلیمہ اس ہنسی کو پہچان نہ سکی۔

"ہاں! وہ تمھاری مدد کریں گے، جب ناظم بھائی کو معلوم ہوا کہ تمھارے ابّا ———" سلیمہ چُپ ہو گئی۔

"جب ابّا مر گئے تو سلیمہ باجی! میری مدد کرنے والوں کا ایک ہجوم میرے گرد جمع ہو گیا تھا"۔ اس نے ایک لمحے کو آنکھیں موند لیں اور اس کے ہونٹ آہستہ آہستہ ہلنے لگے "مگر ان میں گامو نہیں تھا، وہ چلا گیا، چائے پیو گرم گرم، روٹی کھاؤ نرم نرم۔"

جب اس نے آنکھیں کھولیں تو وہ کمرے کے دروازے کے پاس کھڑی تھی اور سلیمہ اسے غور سے دیکھ رہی تھی۔

"تم جانے کیا سوچ رہی ہو سجّو! اور تم غلط بھی سمجھ رہی ہو۔ ناظم بھائی نے مجھ سے کہا تھا کہ تم بہت ذہین ہو۔ لیکن ذہانت کو مصیبتوں میں تنہا دھکیل

دبا جائے تو وہ مر جاتی ہے ——— اور ——— اور بھی بہت کچھ کہہ رہے تھے۔ وہ کہہ رہے تھے کہ اکیلا انسان تو کچھ بھی نہیں ہوتا۔ ہر شخص ایک دوسرے کے ناتے ہی دُکھ سُکھ سمیٹتا ہے۔ اور جانے کیا کیا کہہ رہے تھے اب مجھے یاد نہیں۔"

"ہاں باجی! میری ذہانت کو مرنا نہیں چاہیے۔" وہ دُکھ سے ہنسی۔

"تم کچھ دن رہو گی تو سارے شک دُور ہو جائیں گے۔" سلیمہ اس کا ہاتھ تھام کر کمرے میں داخل ہو گئی۔ ساجدہ نے کھوئی کھوئی نظروں سے کمرے کو دیکھا وہ سوچے جا رہی تھی کہ کیمپ میں جانے کتنے ذہین لوگ ہوں گے مگر ان کی ذہانت کسی کو نظر نہ آئی۔ ذہانت کی تاک میں پھرنے والے بھی اس وقت اندھے ہو گئے۔ پر کون جانے کہ بے بس لڑکی کی ذہانت تو اندھوں کو بھی دکھائی دے جاتی ہے۔

"تم میرے کمرے کو اتنی بد دلی سے کیوں دیکھ رہی ہو ———؟" سلیمہ نے محبت سے اس کا ہاتھ دبایا۔

"نہیں تو ———" اس نے جیسے چونک کر کہا "بہت خوب صورت ہے باجی ——— پریوں اور جنوں کی کہانیوں میں کمرے اسی طرح سجے ہوتے تھے کوئی بہت خوبصورت حوا کی بیٹی اس میں رہتی تھی اور کوئی جن اس کے عشق میں مبتلا ہو کر اسے اٹھا لے جاتا تھا اور ———"

سلیمہ زور زور سے ہنسنے لگی "تم بھی حد کرتی ہو سجو! تمھارا حافظہ کتنا اچھا ہے، میں تو ساری کہانیاں بھول گئی۔ اچھا، اب تم جلدی سے کپڑے بدل لو۔" سلیمہ نے الماری کھول کر ساری اور بلاؤز اس کے ہاتھوں میں ٹھونس دی۔

"مگر باجی! میرے کپڑے ــــــــ"

"کوئی بات نہیں میں تمھارے کپڑے پہن لوں گی۔ بس اب جلدی سے تیار ہو جاؤ۔" سلیمہ نے ساجدہ کو پیار سے غسل خانے میں دھکا دے دیا۔

"میری ساریاں؟ پانچ چھ روپے کی سُوتی ساریاں۔ وہ تو سلیمہ باجی کے جسم میں خراشیں ڈال دیں گی۔" ریشمی ساڑی کو الٹ پلٹ کر دیکھتے ہوئے اس نے سوچا اور پھر نہانے کے لیے چوکی پر بیٹھ گئی۔

جتنی دیر وہ نہاتی رہی یہی سوچتی رہی کہ یہاں کتنے دن رہے گی، یہاں رہ کر جانے زندگی کس طور سے گزرے گی، کیا وہ اپنی تعلیم مکمل کر لے گی، کیا وہ اپنے پیروں پر کھڑی ہو جائے گی، کیا سچ مچ کوئی نیک نیتی کے ساتھ اس کی ذہانت کو زندہ رکھنا چاہتا ہے، مگر وہ کون ہے، اس کا اس سے کوئی رشتہ نہیں، کوئی بندھن نہیں، نفرت کی دیوار کے سوا اس کے درمیان اور کچھ بھی نہیں ــــــ سوچتے سوچتے وہ رو پڑی۔ گرم گرم آنسو ٹھنڈے پانی میں سموتے رہے۔

جب وہ جی بھر کر رو لی تو اسے محسوس ہوا کہ اب وہ ہلکی پھلکی ہو گئی ہے۔ اس نے بڑی ہمت سے سوچا کہ وہ ساجدہ ہے اسے کوئی تاجی نہیں بنا سکتا۔

گیلے بالوں کو تولیہ سے خشک کر کے پیچھے ڈالتے ہوئے اس نے بڑے یقین کے ساتھ سوچا، ابھی کتنے دن گزرے ہیں، صلّو اسے ڈھونڈ لے گا ــــــ "تمھیں ڈھونڈ ہی لیں گے کہیں نہ کہیں" ــــــ وہ دھیرے سے گنگنائی اور جب غسل خانے سے نکلی تو مسکرا رہی تھی۔

"ارے، کیا تم رو رہی تھیں؟ تمھاری آنکھیں سُوجی ہوئی ہیں۔" سلیمہ نے غور سے دیکھا۔

"نہیں۔ پانی بہت ٹھنڈا تھا۔" ساجدہ نے بڑے سکون سے جواب دیا۔

"چلو، اب ناشتے کے لیے چلیں۔ اگر دیر ہو گئی تو مالک ناراض ہوں گے۔ وہ وقت کے بہت پابند ہیں۔"

"مالک کون ہیں سلیمہ باجی؟"

"میرے خالو جان۔ امّی انھیں ہمیشہ مالک کہتی تھیں اس لیے ہم سب بچّوں کی بھی عادت پڑ گئی اور ــــــــ"

ساجدہ دروازے پر جھجک کر کھڑی ہو گئی۔ میز پر ناشتے کا سامان لگا ہوا تھا اور دو عورتیں، ناظم، ایک گھنگریالے بالوں والا، ذرا اچّھی شکل کا نوجوان اور ایک بھاری بھرکم ادھیڑ عمر کا آدمی، یہ سب کُرسیوں پر بیٹھے بڑی ہما ہمی سے باتیں کر رہے تھے اسے دیکھتے ہی سب چُپ ہو گئے اور سب کی نظریں اس کے چہرے پر گڑ گئیں۔

"چلو، اندر چلو، تم گھبرا کیوں رہی ہو؟" سلیمہ نے سرگوشی کے لہجے میں کہا۔

"مجھے آپ کے اس محل اور اس کے باسیوں سے ڈر لگ رہا ہے۔"

"کیا بے وقوفی ہے، تم تو یہ ظاہر کر رہی ہو جیسے کسی جھونپڑے سے اُٹھ کر آئی ہو۔ ناظم بھائی نے سب کو بتا دیا ہے کہ تمھارے ابّا کی دلّی میں کپڑے کی دو دُکانیں تھیں، ایک ایک دُکان پر دو دو منشی کام کرتے تھے۔" سلیمہ

ذراسا جھنجھلا گئی تھی۔

"اندر آجاؤ لڑکیو! کیا مجھ سے ڈر رہی ہو؟ میں کسی کو نہیں کاٹتا۔" ادھیڑ عمر کے آدمی نے اپنی بات پر خود ہی قہقہہ لگایا۔

"میں نہیں گھبراتی مالک! یہ ساجدہ گھبرا رہی ہے۔" سلیمہ نے ہنستے ہوئے جواب دیا۔

موٹی عورت ساجدہ کو بیحد تنقیدی نظروں سے دیکھ رہی تھی۔ وہ نظریں جھکا کر سلیمہ کے ساتھ والی کرسی پر بیٹھ گئی۔

پھولدار پلیٹوں میں آملیٹ کا ایک ایک ٹکڑا اور ایک ایک پراٹھا رکھا ہوا تھا۔

"تم نے سلام کرنا نہیں سیکھا؟" موٹی عورت کے لہجے میں طنز تھا۔

ساجدہ اسی طرح سر جھکائے بیٹھی رہی جیسے اس نے کچھ نہیں سنا۔

"امّی! آپ کو پتا ہے نا، ساجدہ کے ابّا کو مرے آج تیسرا دن ہے۔ یہ بہت رنجیدہ ہے۔" سلیمہ نے سنجیدگی سے ماں کی طرف دیکھا۔

ساجدہ کا جی بھر رہا تھا مگر وہ اپنے آنسو پی گئی۔ ایک لمحے کو اس نے نظریں اٹھا کر سلیمہ کی امّی کو غور سے دیکھا، وہ خوب صورت تھیں مگر ان کے چہرے پر عجیب سی سختی تھی۔ اس نے سوچا بھیگے بھیگے شرمندہ سے چہرے والی لڑکی کی ماں کیا ایسی ہی ہوتی ہے!

"ایک دن سب مر جاتے ہیں بیٹی! اور وہ موت حقیقی ہوتی ہے مگر جیتے جی نہیں مرنا چاہیے، تم کو صبر کرنا ہوگا۔" دبلی پتلی عورت کے لہجے میں

ہمدردی تھی۔ سانولے رنگ، تیکھے نقشے والی اس کمزور عورت کے چہرے پر کچھ ایسی ویرانی تھی جیسے طویل خاموش سرد راتوں میں گیدڑوں کے بولنے کی آواز آ رہی ہو۔

ساجدہ نے دیکھا کہ مالک کے چہرے پر ہلکے سے ناگواری کے جذبات ہوا کے جھونکے کی طرح آ کر گزر گئے۔

"ایک مدت کا غم تو نہیں بیگم!" —— وہ دبلی پتلی عورت سے مخاطب تھے "مہاجروں کے لیے تو ہزاروں غم ہیں، گھر بار لٹ گئے، لاکھوں کے مالک خاک ہو گئے، اب تم دیکھ لو نا، ہمیں یہاں آ کر کیا ملا ہے!" مالک نے ٹھنڈی سانس بھری۔

ناظم جیسے کرسی سے اچھل پڑا "ہمیں کیا ملا؟ ——" پھر وہ سکون سے بیٹھ گیا "ہاں، ہمیں کیا ملا، اس چار کنال کی کوٹھی اور اس کے ساز و سامان کے سوا کیا ملا! شکر ہے کہ آپ نے یہاں آنے سے پہلے اپنا سامان کرشن صاحب کو مناسب قیمت پر دے دیا تھا۔ وہ سامان یہاں کہاں سماتا، سب تباہ ہو جاتا۔" ناظم کے لہجے پر تیز دھار رکھی ہوئی تھی۔

ایک لمحے کو سب خاموش رہے۔ سب لوگ بڑی نزاکت سے پراٹھے کے چھوٹے چھوٹے نوالے بنا رہے تھے۔

"خیر —— وہ سامان مناسب قیمت پر کیا بکتا، مجھے تو اس کا دکھ ہے کہ اپنے آموں کے باغ کی ایک فصل بھی نہ چکھی۔ اس کے ساتھ جو بنگلہ بنایا تھا اس میں ایک دن بھی رہنا نصیب نہ ہوا۔ پنشن کے آرڈر آ گئے تھے، سوچتا تھا

کہ اپنے باغ کی چھاؤں میں سکون سے زندگی کے باقی دن گزاروں گا۔" مالک نے لمبی آہ بھری۔

" اوہ مالک! یہ باغ اور بنگلہ، یہ کب کا واقعہ ہے؟ مجھے تو اب پتا چلا کہ آپ اپنے بیٹوں سے بھی سب کچھ چھپاتے ہیں۔" ناظم اس طرح نوالہ نگل رہا تھا جیسے گلے میں پھنس رہا ہو۔

"مخالفین کو ایسی باتیں نہیں بتائی جاتیں۔" کاظم نے زور سے قہقہہ لگایا" ویسے حیرت تو مجھے بھی ہو رہی ہے۔"

"ظاہر ہے ہم دونوں سگے بھائی ہیں۔" ناظم نے ترچھی ترچھی نظروں سے کاظم کو دیکھا۔

"مالک! اب آپ پہلا کام یہ کریں کہ اپنا کلیم تیار کر لیں ہمیں باغ کے بدلے باغ ملنا چاہیئے۔" کاظم بہت سنجیدہ تھا۔

" افسوس تو یہ ہے کہ میں نے یہاں کسی باغ میں نالہ لگا نہیں دیکھا، ورنہ کب کا توڑ کر مالک کے حوالے کر دیتا۔" ناظم بےحد ڈھٹائی سے ہنسا۔ مالک نے بھی اس کے ساتھ ایک کھوکھلا سا قہقہہ لگایا۔

" بھائی میاں!" کاظم بہت سنجیدہ تھا" آپ کے مذاق سے کچھ نہ ہوگا۔ اگر پاکستان کو مضبوط بنانا ہے تو حکومت کو سب سے پہلے مہاجرین کے مسائل حل کرنے ہوں گے۔"

"اب تک تقریباً ایک کروڑ سے زیادہ مہاجر آچکے ہیں۔" سلیمہ کی امّی نے بڑے انداز سے چہرہ اٹھا کر مالک کی طرف دیکھا۔ یہی تو کہا تھا آپ نے؟

میں نے ٹھیک کہا ہے نا مالک، یہ بڑی تشویشناک بات ہے، ہے نا؟"

"بالکل ٹھیک۔ اور پھر یہ بات بھی ہے کہ اصلی مہاجر تو ہم لوگ ہیں، باقی رہے غربا، تو وہاں بھی جھونپڑیوں میں رہتے تھے، فُٹ پاتھ یا دُکانوں کے تھڑوں پر سوتے تھے، ایسے لوگ یہاں بھی خود ہی اپنی جگہ بنالیں گے۔ حکومت بھی در اصل ہمارے جیسے لوگوں کی آبادکاری کا نعرہ لگا رہی ہے۔" ناظم نے یہ ساری باتیں اتنی سنجیدگی سے کہیں کہ مالک، سلیمہ کی امّی اور کاظم کے چہروں پر غصّے کی پرچھائیاں ناچنے لگیں۔ سلیمہ جانے کیوں مُسکرا رہی تھی۔

"آپ ——؟ آپ بھائی میاں!" ——

کاظم بپھر گیا تھا" میں آپ کی باتیں خوب سمجھتا ہوں۔"

"خاموش رہو۔ تم دونوں ہمیشہ کھانے کی میز کو اکھاڑا بنا لیتے ہو۔" مالک کا لہجہ بیحد تلخ تھا۔ دونوں بھائی سر جُھکا کر چند ہی نوالوں میں پراٹھا کھا گئے۔

"مالک! آپ بچّوں پہ ناراض نہ ہُوا کریں، مجھے دُکھ ہوتا ہے۔ آخر انھیں میں نے پالا ہے۔" سلیمہ کی امّی نے چند لمحے کی خاموشی کے بعد کہا اور پھر مالک کی پیالی میں چائے بنانے لگیں۔

ناظم کی امّی نے سلیمہ کی امّی کو کچھ ایسی نظروں سے دیکھا جیسے کہہ رہی ہوں کہ ماں سے زیادہ چاہنے والی پھاپھا کُٹنی کہلاتی ہے۔

ساجدہ نے سب کے متعلق سوچنا چاہا، ان کی طبیعتوں کو سمجھنا چاہا مگر اس کے سوا وُہ کچھ بھی نہ سوچ سکی کہ مہاجر بننے کے بعد یہاں بھی سب کا حساب

غلط ہو گیا ہے، اور اس کی غلطی کا ذمّے دار ناظم ہے۔ اسے اس وقت شدّت سے اپنے ابّا یاد آ رہے تھے۔

"رات مَیں نے ایک خواب دیکھا تھا" ناظم کی امی بات پُوری بھی نہ کر پائیں کہ ناظم بول اُٹھا:

خواب، خواب نہ دیکھا کریں امّاں! خوابوں میں کچھ نہیں رکھا۔"

مالک زیرِ لب مُسکرائے۔ ساجدہ کا جی چاہا کہ اُٹھ کر ناظم کا مُنہ نوچ لے "کیسا آدمی ہے جو اپنی ماں کو خوابوں کی مٹھاس بھی نہیں چکھنے دیتا۔"

" اور کچھ تو نہیں چاہیے مالک ؟" تاجی جانے کب دبے قدموں آ کر سلیمہ کی کُرسی کے پیچھے کھڑی ہو گئی تھی۔

"نہیں" مالک نے آہستہ سے جواب دیا

ساجدہ نے مُڑ کر دیکھا۔ تاجی کی آنکھیں سُرخ ہو رہی تھیں، پلکیں بھیگی ہُوئی اور گالوں پر آنسوؤں کی نمی کی چمک ابھی تک باقی تھی۔ اس نے کٹتی ہُوئی نظروں سے ساجدہ کو دیکھا اور تیزی سے چلی گئی۔

تاجی چلی گئی مگر ساجدہ کا دل مَسل رہا تھا۔ اس کا جی چاہ رہا تھا کہ وہ اسے زور سے آواز دے کر بُلا لے، اسے یقین دلا دے کہ اب وہ تاجی کے ساتھ ناشتہ تیار کرائے گی، اس کے ساتھ مل کر کھانا پکائے گی۔

"تمھارے ابّا کیا کام کرتے تھے ساجدہ بی بی ؟" مالک نے جیسے خاموشی سے اکتا کر سوال کیا۔

ساجدہ نے جواب دینے کے لئے سر اُٹھایا تو سامنے بیٹھے ہوئے ناظم کی

آنکھیں اُسے جھُوٹ بولنے کی دعوت دے رہی تھیں۔ وہ ایک لمحے کو جھجک گئی۔

"ان کے ابّا کی دہلی میں کپڑے کی دُکانیں تھیں اور وہ ــــــــ" ناظم بات پُوری نہ کر پایا۔

"میرے ابّا ـــــ" ساجدہ نے ناظم کی بات کاٹ کر ٹھنڈی سانس بھری "میرے ابّا کپڑے کی ایک دُکان پر منشی کا کام کرتے تھے۔ وہ ساری زندگی ایک ہی دکان پر کام کرتے رہے، انھوں نے کبھی حساب میں غلطی نہیں کی مگر ناظم صاحب سے ملنے کے بعد ان کا حساب غلط ہو گیا اور ــــــــ" اس کی آواز بھرا گئی۔ اسے محسوس ہُوا کہ کمرے میں خاموشی کی گھٹا چھا گئی ہے اور سب کی نظریں ناظم کی طرف اُٹھی ہُوئی تھیں۔

"بہت خُوب!" کاظم نے کہا اور پھر ایک بلند قہقہہ لگایا تو گھٹا چھٹ گئی۔

"واقعی تم کو ملنا چاہیے۔ ساجدہ بی بی نے ہماری طرح مہاجر بننے سے انکار کر دیا ہے۔ تمھارے لئے یہ عبرت ناک بات ہے۔" ناظم نے کڑی نظروں سے کاظم کی طرف دیکھا۔

ساجدہ چائے کا آخری گھُونٹ پی کر کھڑی ہو گئی۔ ابھی اس نے کُرسی سرکائی تھی کہ سلیمہ کی امّی نے اس کے اُٹھتے ہُوئے قدم روک لئے۔

"ساجدہ بی بی! ذرا تاجی کے ساتھ تم بھی میز پر سے برتن اُٹھوا لو۔ غریب اکیلے کام کر کر کے تھک جاتی ہے۔"

"ساجدہ بی بی! ہمارے گھر میں سچ کی قیمت فوراً ادا کر دی جاتی ہے۔"

ناظم نے آہستہ سے کہا۔

"اس گھر کے فائدے کے لئے میں نے اپنی ساری زندگی کا سُکھ تج دیا مگر کسی نے کچھ نہ سمجھا"۔ سلیمہ کی امّی کا چہرہ سُرخ ہو رہا تھا اور سلیمہ ان کی طرف حقارت سے دیکھ رہی تھی۔

"مجھ سے کہا گیا تھا کہ میں یہاں رہ کر اپنی تعلیم پُوری کر لُوں گی۔ رہ گئے برتن، تو خالہ بی! آپ بھی میرے ساتھ اُٹھوا لیجیے، میں ناجی نہیں ہوں"۔ وہ تیزی سے کمرے سے نکل گئی۔ سب کے ایک ساتھ بولنے کی تیز آوازیں اس کا پیچھا کر رہی تھیں۔

وہ اپنے اُجاڑ کمرے میں آ کر پلنگ پہ پاؤں لٹکا کر بیٹھ گئی۔ اس وقت وُہ اپنی سچائی اور سرکشی پر کسی حد تک مطمئن تھی۔ ایک لمحے کو اسے خیال آیا کہ وہ سب لوگ کیا کہہ رہے ہوں گے۔ وہ لوگ ضرور اس کے سلسلے میں باتیں کر رہے ہوں گے، کم از کم وہ یہ تو ضرور سمجھ گئے ہوں گے کہ مہاجر کیمپوں سے لاوارث لڑکیوں کو سہارے کا دھوکہ دینے کے بعد وہ گھریلو نوکروں کی فوج تیار نہیں کر سکتے۔

وُہ جوش میں اُٹھ کر ٹہلنے لگی۔ دُھول سے اَٹے ہُوئے فرش پر اس کی چپل کے نشان پڑ رہے تھے۔ اسے ایک دم یاد آیا کہ جب وہ چھوٹی سی تھی تو بارش کے بعد آنگن میں ننگے پاؤں چلا کرتی تھی پھر اپنے پیروں کے نشان گن گن کر خوش ہوتی تھی، ایک دو دن میں آنگن سُوکھ جاتا، امّاں بانس کی تیلیوں والی جھاڑو اٹھا کر اس طرح رگڑ رگڑ کر پھیرتیں کہ سارے نشان

مِٹ جاتے. وہ غصّے سے رونے لگتی. امّاں اسے سمجھاتیں "اری پگلی! زمین پہ کس کے قدموں کے نشان باقی رہ جاتے ہیں. آندھیاں اور بارشیں سب مٹا دیتی ہیں۔"

اس نے سوچا کہ جب کمرہ صاف ہو جائے گا تو یہ نشان بھی مٹ جائیں گے مگر یہ محبّت کے نشان قدموں کے نشان کیوں نہیں بن جاتے۔ جانے صلاح الدین کہاں ہو گا؟ وہ جو اسے آگ اور خون کی ہولی میں تلاش کرتا ہوا کیمپ میں آ گیا تھا کیا وہ اب بھی اسے تلاش کر رہا ہو گا؟

وُہ خود کو بہلانے کے لیے کھڑکی میں کھڑی ہو گئی۔ جھاڑ جھنکار میں کہیں کہیں گلاب کے سُرخ پھُول جھانک رہے تھے، چہار دیواری کی کئی اینٹیں گری ہوئی تھیں اور ایک درخت کی موٹی شاخ دیوار پر جھُکی ہوئی تھی۔ گھاس اتنی اُونچی ہو گئی تھی کہ اس پہ وحشت برستی لگ رہی تھی۔

اس نے سوچا کہ یہ گھاس بھی اس کی طرح لاوارث ہے۔ سخت سردیوں میں جب کُہرا پڑے گا تو یہ پیلی پڑ کر مر جائے گی، اور شاید وہ بھی ایک دن اسی طرح مر جائے گی۔

اس وقت اس پر سخت یاسیت طاری تھی جو کار اسٹارٹ ہونے کی آواز کے ساتھ ختم ہو گئی۔ کاظم پھاٹک کی طرف کار بیک کر رہا تھا۔ پھاٹک سے نکل کر اس نے ہاتھ ہلایا تو ساجدہ ایک دم جھجک کر پیچھے ہٹی۔ کیا وہ اسے دیکھ کر ہاتھ ہلا رہا تھا ـــــ ساجدہ نے ایک لمحے کو سوچا، مگر دُوسرے ہی لمحے تاجی بھاگتی ہُوئی آئی، پھاٹک بند کیا اور پھر بھاگتی ہوئی چلی گئی۔ ذرا

دیر بعد ناظمہ سائیکل تھامے آیا اور پھاٹک کھول کر باہر نکل گیا۔ پھر چند منٹ گزرے تھے کہ ایک مریل سے گھوڑے سے جُتا ہوا تانگہ پھاٹک میں داخل ہُوا۔ بُوڑھے کوچبان نے جیسے کھانس کر اپنی آمد کی اطلاع دی اور پھر زور زور سے گھوڑے کو تھپکنے لگا۔ ذرا دیر بعد سلیمہ کتابیں اٹھائے آئی اور تمیز سے سر ڈھانک کر تانگے میں بیٹھ گئی۔

اب پھاٹک منتظر آنکھوں کی طرح کھُلا تھا، کوئی بند کرنے نہ آیا۔

وہ اکتا کر کھڑکی سے ہٹ گئی اب وہ بیحد اداس ہو رہی تھی۔ آخر وہ اس کمرے میں یُوں ہی کب تک بیٹھی رہے گی۔ سلیمہ کالج چلی گئی، جانے کب لَوٹے گی، اور تو سب اس کے لئے اجنبی ہیں۔ کمرے سے نکلے بھی تو کس سے بات کرے، پتا نہیں سب نے اس کے لئے کیا سوچا ہو گا!

اُسے پہلی بار اپنی غلطی کا احساس ہوا، اُسے یُوں سب کو مُنہ توڑ جواب نہ دینا چاہیے تھا، وقت پڑنے پر تو انسان جانے کیا کچھ برداشت کرتا ہے۔ پتا نہیں سلیمہ بھی اب اس سے کس طرح کا سلوک کرے گی۔

جھاڑُو اور چھوٹی سی ٹوکری اٹھائے تاجی کے قدم زمین کو دہلاتے اندر آ گئے۔

"میں نے سوچا ساجدہ باجی! پہلے آپ کا کمرہ صاف کر دُوں۔ پھر کھانا پکانا شروع کروں، آپ خاک دُھول میں بیٹھی کتنی پریشان ہو رہی ہوں گی!"

"تاجی! تم کتنی اچھی ہو، تم مُجھ سے ناراض تو نہیں ہو؟" ساجدہ کو تاجی کی نفرت بھری نظریں یاد آ رہی تھیں۔

"واہ باجی! آپ کیسی باتیں کرتی ہیں۔ نوکرانیاں بھی کسی سے ناراض ہوتی ہیں!" وہ دوپٹہ اتار کر سر پر پیٹنے لگی۔

"تاجی! تم جا کر کھانا پکا لو، جھاڑو مجھے دے دو، میں اپنا کمرہ خود صاف کر لوں گی، پہلے بھی میں اپنا سارا گھر صاف کرتی تھی۔" ساجدہ نے اس کے ہاتھ سے جھاڑو لینا چاہی تو وہ زور سے ہنسنے لگی۔

"آپ نے کمرہ صاف کیا تو ناظم میاں اور سلیمہ باجی مجھے اِس جھاڑو سے جھاڑ کر باہر کوڑے میں پھینک دیں گے۔ سلیمہ باجی جاتے جاتے کہہ گئی تھیں کہ سب سے پہلے یہ کمرہ صاف ہوگا۔" اس کی آواز میں بے بسی تھی۔

ساجدہ نے اطمینان کی سانس لی کہ سلیمہ اس سے ناراض نہیں اور ناظم بھی اپنی بے عزّتی سہہ گیا ہے۔

"تاجی! میں اپنا کمرہ خود صاف کر لوں گی۔" ساجدہ نے بہت پیار سے کہا

"ارے آپ جائیں باجی!" —— اس نے ساجدہ کو شانے سے پکڑ کر کمرے سے باہر کھڑا کر دیا —— "بس ذرا دیر یہیں کھڑی رہیں، مَیں فٹافٹ صفائی کر لوں گی۔ کمرے کے اندر رہیں تو دھول میں اَٹ جائیں گی" —— تاجی نے اندر سے کمرہ بند کر لیا۔

دروازے کے باہر کھڑے وہ ادھر ادھر دیکھنے لگی، گیلری کے اندر کھلنے والے دروازوں پر زنگ برنگے پردے پڑے ہوئے تھے جو اپنا نیا پن کھو چکے تھے اور ایسا لگتا تھا بہت عرصے سے دھوئے نہیں گئے۔ گیلری کے

ایک کونے میں لکڑی کے اسٹینڈ پر رکھے ہوئے پیتل کے گلدان میں مصنوعی پھول لگے ہوئے تھے۔ دن کی روشنی میں اسے ہر چیز سیلی سیلی لگ رہی تھی۔

اس کا جی چاہا کہ وہ سارے کمروں میں گھوم آئے، کون کہاں رہتا ہے، اس وقت سب لوگ کیا کر رہے ہیں، اور ناظم کی اماں، پتا نہیں وہ اسے اتنی اچھی کیوں لگی تھیں۔

"تم یہاں کیا کر رہی ہو؟" ایک پردے کے پیچھے سے سلیمہ کی امّی نکلیں اور اسے کھڑا دیکھ کر ٹھٹھک گئیں۔

"تاجی کمرہ صاف کر رہی ہے، اس نے مجھے یہاں کھڑا کر دیا ہے۔ خالہ بی! میں اپنا کمرہ خود صاف کرنا چاہتی تھی مگر تاجی نہیں مانی۔" ساجدہ نے آہستہ سے جواب دیا۔

"مجھے اچھی طرح معلوم ہے، یہ میری بیٹی کا حکم ہوگا۔ اب تم یہاں آرام کرو۔" ان کے لہجے میں سخت طنز تھا۔ وہ تیزی سے چلتی ہوئی دوسرے کمرے میں غائب ہو گئیں۔ ساجدہ جواب دینے کی حسرت میں تلملا کے رہ گئی۔ "اللہ! ان لوگوں کے ساتھ کتنے دن، اور کیسے گزارہ ہوگا؟" اس نے آہستہ سے اللہ میاں سے پوچھا اور پھر دیوار سے ٹیک لگا کر آنکھیں بند کر لیں۔

"آجائیے ساجدہ باجی!" تاجی نے دروازہ کھول دیا، "دیکھیے میں نے کتنی جلدی صفائی کر دی ہے!"

"سچ، تاجی! تم نے تو کمال کر دیا۔" ساجدہ نے پیار سے تاجی کو دیکھا "اور میرا سامان؟"

"وہ کھانا پکانے کے بعد اٹھا لاؤں گی، میرے کوارٹر میں پڑا ہے۔" وہ گوبر کی ٹوکری اٹھا کر جانے لگی۔

"تاجی! ان کا نام کیا ہے، وہ جو کار پر گئے تھے اور تم نے پھاٹک بند کیا تھا۔" ساجدہ نے پوچھا۔

"کاظم میاں۔" تاجی نے بڑے غور سے ساجدہ کو دیکھا "وہ ناظم میاں کے سگے بھائی ہیں، وہی جو آپ کو کیمپ سے لائے تھے۔" تاجی کی آنکھوں میں شرارت تھی۔

ساجدہ کا جی چاہا کہ وہ گندی گلیوں میں کھیلنے والے بچوں کی طرح تاجی کو ایک موٹی سی گالی دے، مگر صبر کر کے اِدھر اُدھر دیکھنے لگی۔ پوجا کے طاق میں پینٹ کیے ہوئے پھول اور کسی دیوتا کی صورت صاف نظر آ رہی تھی۔

تاجی چلی گئی تو وہ پھر سوچنے لگی۔ یوں بیٹھے بیٹھے وقت کیسے گزرے گا!

رات کھانے کی میز پر سب لوگ موجود تھے۔ مالک اور کاظم بہت اچھے مُوڈ میں تھے۔ سلیمہ کی امّی ساجدہ کے سوا سب کو محبت پاش نظروں سے دیکھ دیکھ کر سالن کا ڈونگھا آگے بڑھا رہی تھیں "حد ہے کوئی کچھ کھاتا ہی نہیں، سب کی چڑیوں جیسی خوراک ہے ـــــ اور آپ صابرہ باجی؟" انھوں نے ناظم کی امّاں کو اتنی محبّت سے دیکھا جیسے کلیجے میں رکھ لیں گی "آپ کو تو اب زبردستی کھلانا پڑے گا۔" اُنھوں نے دو تین بوٹیاں صابرہ باجی کی پلیٹ میں رکھ دیں۔

" اچھّا، تو ان کا نام صابرہ ہے؟" ساجدہ نے ناظم کی امّاں کی طرف دیکھا "چہرے سے بھی صابر معلوم ہوتی ہیں"، وہ سوچ رہی تھی "کیا انسان پر اس کے ناموں کا اثر پڑتا ہے!"

"کھاؤ نا بیگم!" مالک بہت خوش نظر آرہے تھے۔

" تمھاری پڑھائی کیسی ہو رہی ہے سلیمہ؟" ناظم کی امّاں نے آہستہ سے اس طرح پُوچھا جیسے وہ مالک کی بات کا جواب نہیں دینا چاہتی تھیں۔

" ٹھیک ٹھاک خالہ جان!"

ساجدہ نے دیکھا کہ وہ بوٹیاں انھوں نے نوالے سے پلیٹ میں ایک طرف

کر دیں۔ اس کی نظر ویسے ہی ناظم کی طرف اُٹھ گئی۔ وہ جیسے کچھ سوچ سوچ کر کھانا کھا رہا تھا۔

"کیا کوئی خاص بات ہے ناظم؟" مالک نے پُوچھا تو ناظم جیسے چونک پڑا:

"کچھ بھی نہیں۔"

"بات کیا ہو سکتی ہے، ان بیچارے کو سارے زمانے کا غم ستا رہا ہو گا۔" کاظم نے کچھ ایسے لہجے میں کہا کہ مالک اور سلیمہ کی امّی کو ہنستے دیکھ کر ساجدہ کو بھی ہنسی آ گئی۔ مگر سلیمہ کو بیحد سنجیدہ دیکھ کر وہ گھبرا سی گئی۔

"تم اتنے احمق آدمی ہو کہ میں سوچ بھی نہیں سکتا کہ تم میرے بھائی ہو، تمھاری دُنیا صرف تمھاری ذات ہے۔" ناظم نے چڑ کر جواب دیا۔

"کھانے کی میز پر اچھی اچھی باتیں کرنی چاہئیں۔" مالک نے مکدر ہو کر کہا

"میری ذات سے آپ کا کوئی تعلق نہیں، بھائی میاں! آپ انسان دوستی کے خیالی بازار میں، خالی جیب پھرتے ہیں۔ میری زندگی کا مقصد عیش اور مسرت کی تلاش ہے۔" کاظم کا انداز حقارت آمیز تھا۔

"عیش اور مسرت کی تلاش کا ٹھیکہ صرف تم نے کیوں لے رکھا ہے میرے بھیا؟" سلیمہ نے بڑے پیار سے تنبیہ کے انداز میں کہا

"اوہ، سلیمہ باجی!" —— وہ مسخرے پن سے ہنسا "بھائی میاں نے آپ کے خیالات کو بھی زہریلا بنا دیا ہے۔"

"کم بولا کرو کاظم! میں جو کچھ ہوں وہ ہوں، مجھے کوئی کچھ نہیں بنا سکتا۔ تمھارے دل میں عورت کے لیے کتنی حقارت بھری ہوئی ہے۔" سلیمہ

نے غصّے سے مُنہ پھیر لیا اور اس طرح کھانا کھانے لگی جیسے زہر مار کر رہی ہو۔

"آپ تو خواہ مخواہ ناراض ہو جاتی ہیں سلیمہ باجی! میں ایم اے کر کے سی ایس پی کے امتحان میں بیٹھوں گا تو پھر آپ مجھے مان جائیں گی۔"

"خدا وہ دن لائے۔" سلیمہ کی امّی نے دونوں ہاتھ اٹھا کر دُعا کی۔

"کھانا کھاتے وقت ایسی بد دُعا نہ دیجئے خالہ بی!" ——— ناظم نے ہنستے ہوئے کہا "ورنہ یہ آپ کی روٹی بھی چھین کر کھا جائے گا۔"

سلیمہ زور سے ہنسی، مگر اس کی ہنسی کے ساتھ ہی عجیب طرح کی خاموشی چھا گئی۔ سب کے مُوڈ خراب لگ رہے تھے صرف ناظم کی اماں ان تمام باتوں سے بے تعلّق سی بیٹھی آہستہ آہستہ کھا رہی تھیں۔ ساجدہ کے لیے ان سب کو سمجھنا بہت مشکل ہو رہا تھا۔

"اور تو کچھ نہیں چاہیے مالک؟" تاجی بہت تمیز سے سر جھکائے آ کر کھڑی ہو گئی۔

"آج تم نے دل سے کھانا نہیں پکایا تاجی! خیر، جب میں بڑا افسر بن جاؤں گا تو پھر تم اتنی محنت نہ کرو گی۔ اس گھر میں نوکروں کے ڈھیر لگا دُوں گا اور وہ سب تمھارے اشاروں پر ناچیں گے۔ اور پھر تم کبھی اتنا بدمزہ کھانا نہیں پکاؤ گی۔" اس وقت کاظم چھوٹا سا بچّہ لگ رہا تھا۔ سب ہنسنے لگے۔

"اللہ آپ کو خوش رکھے کاظم میاں! ہمارے دن بھی پھر جائیں گے، پھر کہیں ایسا نہ ہو کہ آپ کے نوکر بھی مجھے اپنا نوکر سمجھنے لگیں۔"

"چل چل اپنا کام کر، تیری زبان بڑی تیز ہو گئی ہے۔" سلیمہ کی امّی نے

ڈانٹا۔ اور وہ سر جھکا کر خالی پلیٹیں اٹھانے لگی۔

"اگر بھائی میاں نوکر لاتے رہے تو پھر ایسا ہی ہو گا۔" کاظم نے ترچھی ترچھی نظروں سے ناظم کی طرف دیکھا۔

ساجدہ سر سے پاؤں تک کانپ گئی۔ کاظم اور تاجی نے اس کے اتنے زور سے چٹکی لی تھی کہ وہ درد سے نڈھال ہو رہی تھی۔ اس نے نوالہ پلیٹ میں رکھ دیا۔ دو آنسو اُس کی آنکھوں سے ٹپک کر رخساروں پر بہہ گئے۔ سب لوگ اس کی طرف دیکھنے لگے۔

"تم کمرے سے نکل جاؤ، تاجی!" سلیمہ زور سے چیخی۔

تاجی سہم کر کمرے سے چلی گئی۔ چیخنے کے بعد کا سنّاٹا بے حد بوجھل معلوم ہو رہا تھا۔

"کوئی بات نہیں ساجدہ بیٹی! بس ذراسی مذاق کی بات تھی۔" مالک نے اس طرح رک رک کر دھیمے لہجے میں کہا، جیسے وہ ساجدہ سے ڈرتے ہوں۔

"اور سلیمہ باجی! یہ آپ کی انسان دوستی ہے کہ غریب لڑکی کو اتنی زور سے ڈانٹ دیا۔" کاظم نے غصے سے سلیمہ کو دیکھا

"تم کو ڈانٹتی بھی تو کون سا اثر ہونا تھا کاظم میرے بھیا!" سلیمہ کی آواز بھرا رہی تھی۔

"مجھے اب احساس ہو رہا ہے کہ پاکستان آتے ہوئے میرے بیٹے اپنی تہذیب وہیں چھوڑ آئے ہیں۔" مالک بہت سنجیدہ تھے۔

"یہ تہذیب کو بھی آموں کا باغ سمجھتا ہے۔" ناظم نے کہا اور تیزی سے کمرے سے نکل گیا۔ مالک مُنہ اٹھائے اس کی طرف دیکھتے رہ گئے۔

جب وہ اپنے کانپتے ہُوئے جسم کو سنبھالتی کمرے میں آئی تو اس نے دیکھا کہ اس کا سامان سلیقے سے لگا ہوا ہے اور بستر بچھا ہوا ہے۔ روشنی بجھا کر وہ اوندھے مُنہ لیٹ گئی اور رو رو کر تکیہ بھگو لیا۔ روتے ہوئے وہ اپنے ابّا کو یوں آہستہ آہستہ پکار رہی تھی جیسے وہ یہیں کہیں موجود ہوں۔

"ساجدہ! تم اندھیرے میں کیوں لیٹی ہو؟ کیا ابھی سے سوگئیں؟" سلیمہ نے روشنی کر دی۔ پھر ساجدہ کے پاس بیٹھ گئی۔ اس نے ساجدہ کا سر اٹھایا "اُفوہ! تم نے رو رو کر کیا حال کر لیا ہے! بیوقوف کوئی اتنا بھی روتا ہے؟"

"ابّا یاد آرہے تھے، آج تو مَیں جی بھر کر روئی ہوں، زندگی گزارنے کی فکر نے رونے کی فرصت بھی نہ دی تھی۔"

"مجھے معلوم ہے، مَیں بہت شرمندہ ہُوں ساجدہ! میں ہمیشہ شرمندہ رہتی ہُوں۔"

"مگر کیوں سلیمہ باجی؟" اس نے اپنے آنسو پونچھ لئے اور سلیمہ کی تمتمائی ہوئی صُورت دیکھنے لگی۔

"کچھ بھی نہیں، میرا کیا، مَیں نے تو جب سے ہوش سنبھالا ہے جب سے

شرمندہ ہُوں۔ کتنا اچھا ہوتا کہ میں پاگل ہوتی۔ اب تم سو رہو مجھے آج بہت سا پڑھنا ہے۔"

"میری پڑھائی کا کیا بنے گا باجی؟" ساجدہ نے یُوں ہی پُوچھ لیا۔ اسے یقین تھا کہ اس گھر میں کسی کو اس کی تعلیم کی فکر نہیں۔

"مَیں نے مالک سے بات کی تھی۔ وُہ کہتے تھے کہ کچھ دن صبر کرو، ابھی تو کاظم اور میری تعلیم کے اخراجات بڑی مشکل سے پُورے ہو رہے ہیں۔" سلیمہ کے چہرے پر شرمندگی کے آثار اور بھی گھرے ہو گئے۔

ساجدہ نے نظریں جُھکا لیں، وُہ سوچ رہی تھی ذہانت کو نہیں مرنا چاہیے۔ ذہانت کو موت سے بچانے کے لیے تو اسے یہاں لایا گیا تھا۔

"وہ ٹھیک کہتے ہیں۔" اس نے نظریں اٹھائیں تو سلیمہ اس کا چہرہ تک رہی تھی۔

"تم ضرور پڑھو گی ساجدہ! کاظم کی تعلیم ختم ہونے میں صرف ایک ڈیڑھ سال رہ گیا ہے اس کے بعد تم جو چاہو گی وہی ہو گا۔" سلیمہ نے اس کے کھوئے کھوئے چہرے کو دیکھا "تم کچھ سُن بھی رہی ہو، مَیں کیا کہہ رہی ہُوں؟"

"ہاں باجی!" اس نے اسی کھوئے ہُوئے لہجے میں جواب دیا۔ اسے اپنے ابّا کی بات یاد آ رہی تھی وہ کہا کرتے تھے: "تا تریاق از عراق آوردہ شود، مارگزیدہ مردہ شود۔"

"اب میں جاتی ہُوں تم سو جاؤ۔" اس نے پیار سے ساجدہ کو لپٹایا اور پھر چلی گئی۔

ایک سال، دو سال، تین سال ـــــ کون جانے یُوں ہی کتنے سال گزر جائیں گے۔ کاش! وُہ یہاں نہ آئی ہوتی وہیں کیمپ میں رہتی۔ اس نے تو صلاح الدین سے ملنے کی ساری راہوں میں خود ہی رکاوٹیں کھڑی کر دیں۔ کون جانے وہ اسے ڈھونڈ کر واپس چلا گیا ہو۔ دُنیا کے ڈر سے وہ نگری نگری ڈھنڈورا بھی تو نہیں پٹوا سکتا تھا۔ کیا معلوم وہ پھر چکّر لگائے۔

سوچتے سوچتے اُس نے فیصلہ کر لیا کہ وہ کل کیمپ واپس چلی جائے گی ـــ اس فیصلے کے بعد اسے ذرا سا سکون ملا تو روشنی گُل کر کے بستر پہ آرام سے لیٹ گئی۔

"کیا ابھی سے سو گئیں باجی؟" تاجی آہستہ آہستہ دروازہ کھٹکھٹا رہی تھی تاجی کی آواز سُن کر اس نے اُٹھ کر دروازہ کھول دیا اور روشنی کر دی،

"کیا بات ہے تاجی؟"

"مارے تھکن کے بعض وقت نیند بھی تو نہیں آتی باجی! لیٹے لیٹے تھک گئی تو آپ کے پاس آ گئی" ـــــ وُہ پھٹے ہُوئے کمبل کا ٹکڑا لپیٹ کر فرش پر بیٹھ گئی "یہ حُقّہ آپ پیتی ہیں باجی؟ ہائے کیسا مزہ آتا ہوگا، کہیے تو بھر لاؤں، ابھی چُولھے میں آگ باقی ہے۔" وہ طاق میں رکھے ہُوئے حقّے کو للچائی ہُوئی نظروں سے دیکھ رہی تھی۔

"تاجی! یہ میرے ابّا کی نشانی ہے۔" ساجدہ نے ٹھنڈی سانس بھری۔

"اچّھا!" تاجی نے گھٹنوں پر سر رکھ دیا اور طویل آہ بھری۔

"تاجی! یہ تم اتنی اچھی اردو کیسے بول لیتی ہو؟ تم تو پنجابی ہو اور پنجابی کا

ایک لفظ نہیں بولتیں؟"

تاجی کھلکھلا کر ہنس دی" آپ حیران ہوتی ہیں، ارے باجی! گھر گھر کام کرنے والی لڑکیاں بہت سی زبانیں سیکھ لیتی ہیں۔ میں جس زمیندار کے گھر برتن صاف کرنے جاتی تھی اس کی تین بیویاں تھیں، ایک نکھلؤ (لکھنؤ) سے شادی کر لایا تھا، بالکل گڑیا سی تھی۔ دونوں سوتیں اینکا کئے رہتیں، اس سے کوئی نہ بولتا، میں کام سے فارغ ہوتی تو گھنٹوں اس کے پاس بیٹھی رہتی، ہم دونوں ہی اکیلے تھے باجی! ——"

"تمہارا کوئی بھی نہیں ہے تاجی؟" ساجدہ نے اسے غور سے دیکھا

"پہلے آپ بتائیں باجی! آپ مجھ سے ناراض تو نہیں؟ میں نے تو مذاق کیا تھا، مگر جب آپ رونے لگیں تو اللہ قسم مجھے بھی رونا آرہا تھا۔ سلیمہ باجی کاظم میاں کو تو کچھ کہہ نہ سکتی تھیں میری جان کو آگئیں ——" تاجی کی آواز بھرا گئی "غریب کا قصور نہ ہو جب بھی کون مانتا ہے!" وہ آنسو پونچھنے لگی

"ارے، میں تو بھول بھی چکی تھی، مجھے تم سے شکایت نہیں۔ اب بتاؤ، تمہارے باپ، بھائی، ماں، کیا کوئی بھی نہیں؟"

"کوئی نہیں باجی! ایک ماں تھی سو وہ بھی نہ رہی۔"

"کیا وہ بھی مر گئی؟" ساجدہ کے لہجے میں دُکھ تھا۔

"مر جاتی تو اچھا تھا۔ جب میں بہت چھوٹی تھی تو اس وقت میرا ابّا مر گیا۔ ایک دو سال امّاں مجھے کلیجے سے لگا کر روتی رہی پھر ایک غیر برادری کے آدمی سے اس کی آنکھ لڑ گئی۔ جب برادری کو معلوم ہوا تو پنچایت بیٹھی۔ پتا ہے

باجی! اس نے کیا کہا؟" وہ لمبی لمبی آہیں بھر رہی تھی اور بڑی معصومیت سے مُنہ اٹھائے ساجدہ کو دیکھ رہی تھی۔

"کیا کہا اُس نے؟"

"اس نے بھری برادری میں کہہ دیا کہ عشق ذات پات نہیں دیکھتا، جیسے نیند ٹوٹی کھاٹ نہیں دیکھتی" ——— وُہ چُپ ہو گئی۔

"پھر تاجی؟"

"پھر کیا باجی! برادری کے ڈر سے اس نے مجھے پال تو لیا مگر اس طرح کہ دس سال کی عمر میں مجھے کام پر لگا دیا گیا۔ فصل کٹتی تو دُھوپ میں اکیلی جان سے بالیاں چُنتی، زمیندار کے گھر کے برتن صاف کرتی، کپڑے دھوتی، اور کتنے بہت سے کام ——— میں نے اتنی محنت کی ہے باجی! کہ اب اسی عمر میں تھک گئی ہُوں" وُہ بے بسی سے ہنسی "پھر پاکستان بن گیا باجی! فساد شروع ہو گئے۔ کسی کو ذات برادری کی خبر نہ رہی۔ میری ماں نے مجھے ایک قافلے کے ساتھ ڈھکیل دیا، کہتی تھی اپنے ملک میں جا کر کسی شریف آدمی کا ہاتھ پکڑ لیجیو، اور پھر وہ کڑے والے ہاتھ کو تھام کر غائب ہو گئی" تاجی ایک دم سِسک سِسک کر رونے لگی۔

"مت رو، تاجی!" ساجدہ کی آواز بھرا رہی تھی وہ سوچ رہی تھی کہ ماں کڑے والا ہاتھ تھام کر چلی گئی اور اب بیٹی کو کوئی سُونا ہاتھ بھی نہیں ملتا۔ وہ اسی عمر میں تھکن سے نڈھال ہو گئی ہے۔

"تاجی نے میلی ہتھیلیوں سے آنسو پُونچھ لیے "جب فصل اُٹھتی تو زمیندار کے

گھر سے دانے ملتے تھے اس دن ماں بہت خوش ہو کر بازار میں دانے بیچنے جاتی۔ میں کہتی ہوں ساجدہ باجی! ماں نے مجھے بھی دانوں کی طرح کسی کے ہاتھ بیچ دیا ہوتا تو ——" اس نے ٹھنڈی سانس بھری اور پھر اپنے گریبان میں ہاتھ ڈال کر کچھ تلاش کرنے لگی —— "باجی! میں ذرا سی سگریٹ پی لوں" سگریٹ کا آدھا جلا ہوا ٹکڑا اس نے انگلیوں میں تھام لیا۔

"بری بات تاجی! تم سگریٹ پیتے ہوئے بہت بری لگو گی"۔

"بس کبھی کبھی کاظم میاں ایک دو سگریٹیں دے دیتے ہیں"۔ سگریٹ سلگا کر اس نے اطمینان سے ایک لمبا کش لگایا۔

"تاجی! اب تم ان سے سگریٹ مت لینا"۔ ساجدہ نے سختی سے کہا

"خواہ مخواہ غصے نہ ہوں باجی! جب دھوئیں کا چکر چڑھتا ہے تو باجی! میری ساری تھکن اتر جاتی ہے۔ کاظم میاں تو بڑے اچھے ہیں۔ اس گھر میں صرف وہی دیالو ہیں۔ کبھی کبھار ایک چونی بھی دے دیتے ہیں سب سے چھپا کر۔"

"اور تم کو لیتے ہوئے شرم نہیں آتی؟" اسے تاجی پر سخت غصہ آ رہا تھا۔

"آپ نہیں جانتیں باجی! یہاں سب لوگ کیسے ہیں، سب کمینے ہیں۔ کوئی ایک پیسہ نہیں دیتا۔ کاظم میاں کہتے ہیں: تاجی! جب میں افسر بن جاؤں گا تو تم کو تنخواہ دیا کروں گا۔ ارے باجی! وہ بہت اچھے ہیں۔ آپ بتائیے، سلیمہ باجی کی طرح کب سے کالج پڑھنے جائیں گی؟" تاجی کی نظروں میں سخت حقارت تھی۔

ساجدہ اس کی نظروں سے گھبرا گئی "بس تاجی! تھوڑے دن بعد مجھے

بھی داخلہ مل جائے گا۔"

تاجی ہنستے ہنستے لوٹ پوٹ ہو گئی "یہ تھوڑے دن کبھی ختم نہ ہوں گے باجی! یہاں صرف سلیمہ باجی کی امّی کا حکم چلتا ہے، مالک ان کے قبضے میں ہیں، وہ بھی میری ماں کی طرح" —— تاجی ایک دم خوفزدہ ہو گئی۔ سگریٹ پاؤں سے مسل کر وہ ساجدہ کے آگے ہاتھ جوڑ کر کھڑی ہو گئی —— "وہ مجھے مار ڈالیں گے آپ کسی سے میری شکایت نہ کیجئے گا، میں آپ کے پاؤں چھوتی ہوں۔"

ساجدہ حیران نظروں سے سامنے کھڑی ہوئی تاجی کو دیکھ رہی تھی اور سوچ رہی تھی کہ کیا یہ سچ ہے، کیا سلیمہ اسی لیے شرمندہ رہتی ہے؟

"آپ کیا سوچ رہی ہیں ساجدہ باجی؟ آپ کو میری قسم ہے کسی سے کچھ نہ کہیے گا۔" وہ ڈر کے مارے ساجدہ کے پیروں سے لپٹ گئی۔

"میں کسی سے کچھ نہ کہوں گی۔" اس نے تاجی کو شانوں سے پکڑ کر کھڑا کر دیا۔

"میں کل کیمپ واپس جا رہی ہوں۔"

"کیا؟ —— کیا آپ ——؟" تاجی پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی اور پھر دروازے کی طرف جانے لگی "مت جانا باجی! مت جانا" —— وہ کمرے سے نکل گئی۔

صبح ناشتہ کرتے ہُوئے اس نے سر اٹھا کر سب کی طرف سرسری نظر سے دیکھا۔ سب بڑے انہماک سے ناشتہ کر رہے تھے۔

"میں آج یہاں سے جا رہی ہُوں۔" ساجدہ نے یہ بات مدھم لہجے میں بڑی آسانی سے کہہ دی۔ اسے اطمینان تھا کہ اس کے یہاں رہنے یا چلے جانے سے کسی پر کوئی اثر نہ پڑے گا، مگر وہ یہ دیکھ کر حیران رہ گئی کہ سب اسے سوالیہ نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ ناظم نے ہونٹوں تک جاتی ہُوئی چائے کی پیالی واپس رکھ دی تھی۔

"کہاں جاؤ گی تم؟" سلیمہ نے غصّے سے اس کی طرف دیکھا

"مہاجر کیمپ، جہاں سے آئی تھی، وہیں۔" ساجدہ نے سکون سے جواب دیا۔

"کیا تم پاگل ہو گئی ہو؟" سلیمہ نے تقریباً چیخ کر پوچھا۔ "تم کہیں نہیں جا سکتیں۔" اس نے میز پر زور سے گھونسا مارا۔

اس شرمندہ رہنے والی لڑکی کا یہ رُوپ دیکھ کر ساجدہ حیران رہ گئی۔ مگر اس وقت وُہ اسے بہت اچھی لگ رہی تھی۔

"کیا یہ میز مفت میں آگئی ہے! اگر توڑنے کی خواہش ہے تو اٹھا کر پھینک دو۔" سلیمہ کی امّی کو بھی غصّہ آگیا تھا۔

"اتنا غصّہ نہیں کرتے بیٹی!" مالک نے آہستہ سے کہا۔

"آپ میری والدہ صاحبہ کی طرف سے نہ بولیں مالک!" سلیمہ کا لہجہ اسی طرح سخت تھا۔

ساجدہ گھبرا کر کھڑی ہوگئی وہ یہ تو نہ چاہتی تھی کہ معاملہ بگڑ جائے۔ اور نہ اسے یہ توقّع تھی کہ سلیمہ اس کے جانے کے نام پر اتنی جذباتی ہو جائے گی۔ اس کے لیے یہ بات بھی حیران کُن تھی کہ وُہ اپنے خالو سے اس طرح بات کر سکتی ہے، اور وہ مسکرا کر اس کی بات ٹال سکتے ہیں۔

"خواہ مخواہ سب کا مُوڈ خراب کر رہی ہیں آپ ——" کاظم نے اپنی کُرسی سے اُٹھ کر سلیمہ کے شانے پر ہاتھ رکھ دیا۔ "سلیمہ باجی! اگر یہ چلی گئیں تو ہم لوگ جا کر انہیں پھر سے واپس لے آئیں گے —— ٹھیک ہے نا بھائی میاں؟" اس نے شرارت سے ناظم کی طرف دیکھا۔

"کسی کو زبردستی تو نہیں روکا جا سکتا۔" سلیمہ کی امّی پھر بول اُٹھیں۔

"امّی! خدا کے واسطے آپ نہ بولئے۔" سلیمہ کی آواز میں التجا اور بیچارگی تھی، اب پھر وہ شرمندہ سی نظر آرہی تھی۔ "تم کہیں نہیں جاؤ گی، تم کو یہاں کوئی تکلیف نہ ہو گی۔" اس نے ساجدہ کا ہاتھ تھام کر کُرسی پر بٹھا دیا۔

"تم اکیلی ہو اور یہ دُنیا بہت بڑی ہے۔" ناظم کی اماں آج پہلی بار ساجدہ سے مخاطب ہُوئی تھیں۔

"تو پھر اماں! مجھے اس دنیا کا پتا بتا دیجئے جو بہت اچھی ہو۔" ساجدہ کی آنکھوں میں آنسو آرہے تھے۔

اماں نے اس کی طرف اس طرح دیکھا جیسے کہہ رہی ہوں، مَیں اس بہت اچھی سی دُنیا کا پتا لکھنا بھول گئی تھی۔

"تم میری بیگم کی بات نہیں ٹال سکتیں، ساجدہ بی بی! تم یہاں خوش رہو گی، کچھ دن بعد جی لگ جائے گا۔ میں ٹھیک کہہ رہا ہُوں نا سلیمہ بیٹی؟" مالک جیسے گھگھیا رہے تھے۔

"ہاں مالک! میں اسے نہیں جانے دُوں گی۔" سلیمہ نے نظریں جھکا کر جواب دیا "مجھے جانے کیا ہو جاتا ہے، ایک دم غصہ آجاتا ہے۔ آپ نے مجھے معاف کر دیا ہے نا؟"

"بات کیا تھی؟" مالک ہنس رہے تھے۔

"بات بس اتنی سی ہے کہ سب لوگ خواہ مخواہ اصرار کر رہے ہیں، یہ ساجدہ بیگم کہیں بھی نہیں جاتیں —— ٹھیک کہہ رہا ہُوں نا بھائی میاں؟"

ناظم نے کوئی جواب نہ دیا، وہ خاموشی سے سر جھکائے کمرے سے نکل گیا تو کاظم نے ایک کھنکتا ہوا قہقہہ لگایا۔

ساجدہ کا جی چاہا کہ وُہ اُٹھ کر کاظم کے ہونٹ سی دے تاکہ وہ پھر کبھی ایسے کمینے قہقہے نہ لگا سکے۔ "میں جاؤں گی، میں ضرور جاؤں گی۔" اس نے زور سے کُرسی کھینچی، اگر میں کاظم صاحب کے ایسے کمینے قہقہے سنتی رہی تو پاگل ہو جاؤں گی۔"

کاظم نے آنکھیں پھاڑ کر حیرت سے ساجدہ کو دیکھا وہ اسے کھا جانے والی

نظروں سے دیکھ رہی تھی۔

"تم عجیب لڑکی ہو، اتنی زور سے کرسی کھینچی کہ فرش اکھڑ جائے، گھر کی ایک ایک چیز کا خیال کرتے کرتے ساری عمر بتا دی۔ اور، اور تمھاری زبان ——؟"
سلیمہ کی امّی کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا۔

"ساجدہ! تم اپنے کمرے میں جاؤ، کالج سے واپس آ کر تم سے بات کروں گی۔

—— اور تم میرے کاظم بھیّا! —— تم ضرور سی ایس پی کے امتحان میں اوّل آجاؤ گے" —— سلیمہ کی آواز بھرا رہی تھی۔

"تم اس لڑکی کے لیے اپنے بھائی پر طنز کر رہی ہو جو دو دن بعد تمھارے پاس سے جانے کو کہہ رہی ہے؟" سلیمہ کی امّی نے کہا اور تیز نظروں سے ساجدہ کو دیکھا۔

ساجدہ تیزی سے اپنے کمرے کی طرف چلی گئی۔ پھر کس نے کیا کہا، اسے کچھ پتا نہ چلا۔

جب وہ اپنے کمرے میں آئی تو اسے ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ اندھی ہے، گونگی ہے، بہری ہے، اس کا دماغ گہری نیند سو گیا ہے، اب وہ کچھ بھی نہیں سوچ سکتی۔

اپنے بستر پر دیر تک وہ اسی کیفیت میں پڑی رہی۔ دروازے پر ہلکی سی دستک ہوئی مگر اس نے جیسے کچھ بھی نہ سنا۔

بھڑا ہوا دروازہ آہستہ سے کھلا۔ ناظم اندر داخل ہوا اور دروازے کے پاس ہی دیوار سے ٹیک لگا کر کھڑا ہو گیا۔ اس وقت ساجدہ کا سویا ہوا دماغ

ایک دم جاگ پڑا۔ وُہ بستر پر پاؤں لٹکا کر بیٹھ گئی۔

"کیا اب آپ میرے فیصلے کا حساب غلط کرنے آئے ہیں؟" اس نے کھوئی کھوئی نظروں سے ناظم کی طرف دیکھا۔

"جو کچھ ہُوا، میں اُس کی معافی مانگنے آیا ہُوں۔ ویسے مَیں اُن باتوں کا ذمہ دار نہیں، میرا قصور صرف اتنا ہے ساجدہ بی بی! کہ مَیں اس گھر کا ایک فرد ہُوں اور بس۔" ناظم نے اس کی طرف دیکھے بغیر سب کچھ کہہ دیا۔

"پھر میں کیا کر سکتی ہُوں!" اس نے بے اعتنائی سے کہا "نہ میں نے اس گھر کا تالہ توڑا تھا، نہ میں نے آپ کو اس گھر کا فرد بنایا ہے، اس لیے میرا بھی کوئی قصور نہیں۔" اس نے ناظم کی طرف سے مُنہ پھیر لیا۔

"میں صرف یہ کہنے آیا ہُوں ساجدہ بی بی! کہ تم کہیں نہیں جاؤ گی، تم کو راستے بھی نہیں معلوم، یُوں ہی بھٹکتی پھرو گی، تم نہیں جاؤ گی۔" ناظم جواب سُنے بغیر جس طرح آیا تھا اسی آہستگی سے چلا گیا۔

ساجدہ کا جی چاہا کہ وُہ بھاگ کر ناظم سے پُوچھے "تم کون ہو، تم میرے کیا لگتے ہو، مجھے روکنے کا حق تم کو کس نے دیا ہے؟"

وہ یہ سب کچھ پُوچھنے کے بجائے اسی طرح بیٹھی رہی۔ غصّے پر قابو پانے کے بعد وہ سوچ رہی تھی کہ اُسے راستے نہیں معلوم، وُہ اگر بھٹکتی پھری تو کوئی حضرتِ خضر راستہ بتانے نہیں آئیں گے، کچھ نہیں تو یہاں سلیمہ تو ہے ——— سلیمہ ———

وُہ بات اب پرانی ہوگئی تھی، جب اس نے اس گھر میں رہنے کا فیصلہ کیا تھا۔ اُس دن وُہ چُپ چاپ اپنے کمرے میں پڑی رہی تھی اور رات رو کر کاٹی تھی اور آخر صبر کی اندھیری کھائی میں گر گئی تھی۔ اس رات اس نے سوچا تھا کہ عورت کا دُوسرا نام محرومی، صبر اور قناعت ہے۔ مگر یہ سوچنے کے بعد وہ تلملا اٹھی تھی۔ اس نے بڑے عزم سے فیصلہ کیا تھا کہ وہ عورت کے اِن مشہور و معروف ناموں کو حرفِ غلط کی طرح مٹا دے گی ——— اس دن کے بعد سے وُہ گھر میں اس طرح رہ رہی تھی جیسے یہ اس کا حق ہے۔ گھر میں سوائے کاظم اور سلیمہ کی امّاں کے سب اس سے مانوس ہو گئے تھے۔

کاظم اکثر اس کو چھیڑتا "گریٹ نپولین! خالہ بی کو اور مجھ کو فتح کرو تو جانوں، بیوقوف لوگ تم کو خواہ مخواہ اپنا سمجھ کر تمھاری ہاں میں ہاں ملاتے ہیں۔"

"تم ——— ؟ تم تو کوئی چیز ہی نہیں ہو۔ رہ گئیں خالہ بی، تو مجھے ان سے ابھی کوئی دل چسپی پیدا نہیں ہُوئی۔" ساجدہ بہت آرام سے جواب دیتی اور کسی کام میں یُوں منہمک ہو جاتی جیسے اس کے پاس کھڑا ہوا کاظم محض مٹّی کا تودہ ہو۔

"میں ——" وہ غرور سے سینہ پھلا لیتا —— "میں بہت بڑی چیز ہوں ساجدہ بیگم! آپ کو بھی پتا چل جائے گا۔" اس کے لہجے میں غضب کی دھمکی ہوتی۔ ایک ذرا دیر کو ساجدہ خوف سے ڈول جاتی مگر پھر اپنے کو پہلے سے کہیں زیادہ مضبوط محسوس کرنے لگتی۔

سیاسی دھما چوکڑی کے درمیان جب سب لوگ کھانا کھا چکے تو وہ اماں بی کے ساتھ ان کے کمرے میں چلی گئی اسے ناظم سے جتنی نفرت تھی اس کی اماں بی سے اسی قدر انسیت محسوس ہوتی تھی۔ جانے کیوں اسے اماں بی کے رُوپ میں وُہ پیاسی فاختہ نظر آتی جو گرمی کی شدّت سے بے چین پانی کی تلاش میں پھر رہی ہو۔ آجکل وُہ ویسے بھی اماں بی کے کمرے میں زیادہ وقت گزارتی کیونکہ سلیمہ کو ایم۔اے کا کورس بہت مشکل لگ رہا تھا۔

"کیا واقعی تم مجھ سے محبّت کرتی ہو ساجدہ؟" امّاں بی کے اچانک سوال سے وہ گھبرا گئی۔

"محبّت ——؟" اس نے خود کو سنبھالا "آپ جو کچھ سمجھیں امّاں بی! مجھے آپ کے پاس سکون ملتا ہے اور مجھے محبّت کی وہی خوشبو محسوس ہوتی ہے جو ابّا کے پاس سے آتی تھی۔" اس نے بے بسی سے سر جُھکا دیا۔

امّاں بی کے چہرے پر ایک لمحے کو عجیب سا سکون جھلکا اور پھر دوسرے ہی لمحے غائب ہوگیا۔

"تم کو پتا ہے مجھ سے تو میری اولاد بھی محبّت نہیں کرتی۔" انھوں نے اداسی سے کہا اور بے معنی نظروں سے ادھر اُدھر دیکھنے لگیں۔

"یہ کیسے ہوسکتا ہے امّاں بی؟"

"سب کچھ ہوسکتا ہے۔ کاظم ہُوبہو اپنے باپ کا بیٹا ہے۔ اور ناظم، وہ مجھ سے اس لیے دُور ہوگیا کہ میں اپنے حق کے لیے لڑنا نہیں جانتی۔ وہ بیوقوف یہ نہیں جانتا کہ لڑ کر بہت کچھ مل سکتا ہے مگر محبت نہیں مل سکتی۔"

ساجدہ کو ایک دم تاجی کی بات یاد آگئی "سلیمہ کی امّی بھی میری ماں کی طرح ہیں باجی!"

"آپ کی محبت کو کس نے چھینا ہے امّاں بی؟" ساجدہ نے امّاں بی کا ہاتھ آہستہ سے اپنے ہاتھ میں تھام لیا جو برف کی طرح ٹھنڈا ہو رہا تھا۔

محبت چھیننے کا سوال ہی نہ تھا۔ ہماری بچپن ہی میں منگنی ہوگئی تھی۔ جب میں ذرا بڑی ہُوئی تو ہر بے وقوف لڑکی کی طرح اپنے منگیتر سے محبت کرنے لگی، مگر وُہ میری خالہ زاد بہن آمنہ سے محبّت کرتے تھے۔ آمنہ کو جانتی ہو؟"

"نہیں۔"

"سلیمہ کی ماں، تمھاری خالہ بی۔ مگر یہ باتیں کوئی نہیں جانتا تھا۔ ہماری شادی ہوگئی، ناظم پیدا ہوا۔ اور جب کاظم اس دنیا میں آنے والا تھا تو آمنہ بیوہ ہوگئی۔ تمھارے مالک آمنہ اور سلیمہ کو اپنے گھر لے آئے۔ میں بہت خوش تھی دنیا نے بھی بہت سراہا۔ وہ جانے کیا سوچنے لگیں۔"

"پھر امّاں بی؟"

"پھر کیا، مجھے سب کچھ معلوم ہوگیا۔ آمنہ کے آنے کے بعد وہ شدّت سے شراب پینے لگے۔ میں نے اس شخص سے قطع تعلق کرلیا۔ کاظم سے مجھے صرف

اس لیے نفرت سی ہوگئی کہ وُہ آمنہ کی گود میں پل رہا تھا اور اس کی شکل اپنے باپ سے ملتی ہُوئی تھی ـــــ افوہ! ـــــ" وُہ دونوں ہاتھوں سے اپنے چہرے کو رگڑنے لگیں ـــــ" نفرت کا جہنم اصل جہنم سے بھی زیادہ خوفناک ہوتا ہے۔ کیا میں غلط کہہ رہی ہُوں؟"

"نہیں!"

"اور ناظم مجھ سے یہی چاہتا تھا کہ اس جہنم سے نکل جاؤں۔ جب اس نے ہوش سنبھالا وہ یہی ضد کرتا تھا کہ مَیں اس کے باپ کو چھوڑ دُوں، اس سے طلاق لے لُوں، دُوسری شادی کر لُوں، اور ـــــ" وُہ ایک دم پھوٹ پھوٹ کر رونے لگیں اور پھر جلدی سے آنسو پونچھ اور یُوں سر نیوڑھا کر بیٹھ گئیں جیسے احساسِ ندامت ستا رہا ہو۔ بھلا ساجدہ ان کی کیا لگتی تھی جو اس سے سب کچھ کہہ بیٹھیں۔

ساجدہ کو ان کے چہرے پر لکھی ہُوئی یہ تحریر بہت صاف نظر آ رہی تھی۔

"امّاں بی! میں آپ کی بیٹی ہُوں، کیا آپ کو مجھ پر ذرا بھی اعتبار نہیں؟" ساجدہ نے آہستہ سے پُوچھا مگر اس سوال کے ساتھ ہی وہ شرمندہ ہوگئی۔ زبان کا کیا اعتبار۔ وہی زبان اللہ کو پکارتی ہے اور وہی زبان گالی بکتی ہے۔ امّاں بی اسی طرح سر جھکائے چُپ چاپ بیٹھی جانے کیا سوچ رہی تھیں۔ ساجدہ کی سمجھ میں نہ آیا کہ وُہ کیا کہے۔ وُہ سوچنے لگی کہ کیا مالک میں اتنی بھی اخلاقی جرأت نہ تھی کہ شادی سے پہلے وُہ اپنی محبّت کا اقرار کر لیتے۔ دو زندگیوں کو دوزخ کے دہانے پر چھوڑ کر خود شراب کے سمندر میں غرق ہو گئے۔ حقیقتوں سے گریز کا کتنا سہل طریقہ ہے۔ محبت کا ڈھونگ رچانے کا کتنا گھٹیا انداز ہے۔ پتا نہیں مالک

اس سلسلے میں کبھی کچھ سوچتے بھی ہوں گے کہ نہیں۔ اسے آج پہلی بار سلیمہ کی اماں سے ہمدردی محسوس ہو رہی تھی۔ کون سوچتا ہوگا اس کے لیے کہ وہ مجسم جیل کی کوٹھری ہے جہاں اس کے جذبات، خیالات، آنسو، آہیں، سب محبّت کے جرم میں سزا کاٹ رہے ہیں۔

"تم آگئی ہو تو میری تنہائی کچھ کم ہوگئی ہے۔ میں بیس سال سے بالکل اکیلی ہُوں۔ سلیمہ میرے قریب آنے کے سارے جتن کر چکی مگر جانے کیوں میں اسے اپنا نہ بنا سکی۔ وُہ بہت اچھی لڑکی ہے۔ میں اتنا ضرور جانتی ہُوں کہ وُہ اپنی ماں سے نفرت کرتی ہے۔"

ساجدہ نے کوئی جواب نہ دیا۔ اس کے سامنے سلیمہ کا شرمندہ چہرہ ایک دم گھوم گیا۔

ناظم دھیرے دھیرے قدم اٹھاتا کمرے میں داخل ہُوا تو ساجدہ جانے کے لیے اُٹھ گئی۔

"بیٹھو ساجدہ بی! میں چلا جاتا ہُوں۔" اس نے ساجدہ کو گہری نظروں سے دیکھا۔

ساجدہ جواب دیے بغیر وہاں سے نکل کر اپنے کمرے میں آگئی۔ کُھلی ہُوئی کھڑکی سے آتی ہوئی چاندنی اس کے بستر پر لوٹ رہی تھی۔ وہ روشنی کیے بغیر لیٹ گئی۔ وُہ سوچے جا رہی تھی، شاید اس دنیا میں محبّت کے نام پر سب سے زیادہ ظلم ہوئے ہیں۔ محبّت کے نام لیواؤں نے کتنے دُکھ، کتنی محرومیاں اور کتنی چھین جھپٹ کو جنم دیا ہے۔ اس محبّت کے نام پر کیا کچھ نہیں لوٹ لیا،

پھر بھی لوگ محبت کرنے سے باز نہیں آتے ——" ساجدہ کو اپنی ڈھٹائی پر ایک دم رونا آگیا اور جب وہ خُوب جی بھر کر رو لی تو اس کے دل نے گواہی دی ، تم صلاح الدین کو کبھی نہ بھُول سکو گی ساجدہ ، تمھارا انتظار کبھی ختم نہ ہو گا۔

وہ اُٹھ کر کھڑکی کے پاس کھڑی ہو گئی۔ چاندنی میں درخت اور پودے سب دھُواں دھُواں سے نظر آرہے تھے مگر پیپل کے پُرانے گھنے درخت کے نیچے رکھی ہُوئی دو بڑی بڑی گٹھڑیاں سی نظر آرہی تھیں —— جانے کیا رکھا ہے، شاید کوئی بیٹھا ہے —— مگر کون ؟—— وُہ حیران ہو رہی تھی۔

ذرا دیر بعد جب وہ گٹھڑیاں اُٹھ کر چلنے لگیں اور اس کی کھڑکی کے پاس سے گذریں تو جیسے اس کے پاؤں جم کر رہ گئے۔

تاجی گیراج کی طرف چلی گئی اور کاظم برآمدے میں آگیا۔ پھر گیلری کے دروازے کھُلنے اور بند ہونے کی آواز آئی۔

ساجدہ جیسے اپنے بستر پر آکر گر سی پڑی —— تاجی کی ماں نے اسے قافلے کے ساتھ دھکا دے کر کہا تھا کہ وُہ اپنے ملک میں کسی شریف آدمی کا ہاتھ پکڑ لے —— یہ بات اسے بار بار یاد آرہی تھی۔ اب وہ تاجی کو کیسے سمجھاتی کہ جو ہاتھ اسے تھام رہے ہیں وہ بہت کمینے ہیں۔

صبح تڑکے جب وُہ اپنا بستر اٹھائے کمرے میں آئی تو اسے اچانک بیحد سناٹے کا احساس ہوا۔ رات جب وہ پچھلے لان میں سونے کے لیے گئی تھی تو رات کی رانی کی بھینی بھینی خوشبو میں اسے اپنا گھر یاد آرہا تھا اور وہ سلیمہ کی ہر بات پر ہُوں ہاں کر کے رہ جاتی تھی۔ اس ایک سال میں اس نے خود سے اتنا سمجھوتہ

کرلیا تھا کہ اسے یادوں کی شدت سے چھٹکارا مل گیا تھا، یادوں کے ساتھ تنہائی سوت جیسا سلوک کرتی ہے اس لیے وہ ہر وقت کسی نہ کسی طرح خود کو مصروف رکھتی ——

وہ کمرے سے نکل کر جلدی سے گیلری میں آگئی، جہاں خالہ بی گلدانوں کو جھاڑن سے پونچھ رہی تھیں، پھر وہ کاظم کے کمرے میں داخل ہوگئیں۔

"ذرا ان تینوں کے کمروں کی حالت دیکھو۔ اتنے بڑے ہو گئے مگر ذرا سلیقہ نہیں —— سلیمہ تو جیسے جان کر اپنی ہر چیز الٹ پھینکتی ہے اور کاظم" —— وہ بڑے پیار سے مسکرائیں۔ "وہ تو جیسے دو سال کا بچہ ہے۔ اس کا کمرہ ٹھیک کرتے ہوئے مجھے پسینے آجاتے ہیں، بس ناظم ایک ذرا ڈھنگ سے رہتا ہے۔" خالہ بی بڑے پیار سے کاظم کا کمرہ ٹھیک کر رہی تھیں اور ساجدہ ایک طرف کھڑی دیکھ رہی تھی۔ اس نے سوچا کہ سلیمہ اور ناظم کے کمرے وہ خود بھی صاف کرا لے گی۔

"آپ کا کاظم بچہ نہیں، وہ تو سب سے بڑا ہے۔" اس نے طنزیہ کہا مگر خالہ بی سمجھیں نہیں۔

"ہاں —— ویسے تو بڑا بقراط ہے، پڑھنے میں سب سے تیز۔ شریر ایسا کہ کسی کو چپ بیٹھے نہیں دیکھ سکتا۔ ناظم کی طرح خواہ مخواہ سنجیدہ نہیں رہتا۔ کاظم کو میں نے پالا ہے نا، جب وہ پیدا ہوا تو میں نے اسی وقت گود لے لیا تھا، سلیمہ دو سال کی تھی۔ باجی نے تو کاظم کو کبھی ایک منٹ کے لیے بھی اپنی گود میں نہیں لیا۔ سلیمہ کا دودھ چھڑایا تھا تو میں سمجھتی تھی اب دودھ نہ پلا سکوں گی۔ مگر اللہ کی قدرت کہ دودھ کی نہریں بہنے لگیں۔"

"مجھے سب معلوم ہے۔" ساجدہ نے بہت رکھائی سے کہا۔

"تمھیں کیا معلوم ہے؟" وہ جیسے چونک پڑیں۔

"یہی کہ آپ نے کاظم کو کس طرح پالا، میں تو کہتی ہوں کہ اگر آپ نہ ہوتیں تو اس گھر میں کیڑے پڑجاتے، اور کاظم تو شاید زندہ ہی نہ بچتا۔" اس نے بے حد نارمل لہجے میں کہا۔

"خدا اسے میری بھی زندگی دے دے۔ تم سچ کہتی ہو میں نہ ہوتی تو یہ گھر یوں نہ نظر آتا۔ بیچاری باجی تو ہمیشہ کی ایسی ہی دُبلی پتلی ہیں۔ پھر سب سے الگ تھلگ رہتی ہیں۔ ویسے دیکھو نا، میرے ہوتے انھیں کام کرنے کی ضرورت بھی کیا ہے۔" انھوں نے مسرت سے کہا۔

"کیا آپ لوگوں نے آج کی خبریں نہیں سُنیں؟" ناظم نے آہستہ سے پوچھا۔ اسے اس وقت کاظم کے کمرے میں دیکھ کر دونوں ہی حیران ہوگئیں۔

"قائدِ اعظم کا انتقال ہوگیا۔" ناظم نے مدھم آواز میں اطلاع دی اور کمرے سے نکل گیا۔

ساجدہ کو محسوس ہوا جیسے اس کے دل کے قریب قائدِ اعظم کی لاش پڑی ہے اور وہ رو بھی نہیں سکتی۔

"ہائے اب کیا ہوگا!" خالہ بی دوڑتی ہوئی گیلری میں چلی گئیں۔ ساجدہ ان کے پیچھے پیچھے چل رہی تھی "ارے ابھی تو چین سے بیٹھنا بھی نصیب نہیں ہوا۔ ارے سُنا آپ نے، قائدِ اعظم کا انتقال ہوگیا مالک! آپ کہاں ہیں؟" انھوں نے چیخ کر کہا اور پھر ایک دم رونے لگیں۔

خالہ بی کی چیخ نے سب کو بوکھلا دیا تھا۔ امّاں بی اپنے کمرے کی دہلیز پر ایک لمحے کو نمودار ہوئیں اور پھر غائب ہوگئیں۔ تاجی گندھے ہوئے آٹے سے لتھڑے ہاتھوں سے کلیجہ تھامے کاظم کے پاس کھڑی تھی۔ ساجدہ نے دیکھا ہی نہیں کہ وہ کب اور کہاں سے آگیا تھا۔

"کاظم میاں! اب کیا ہوگا، میں اپنی امّاں کے پاس نہیں جاؤں گی۔" وہ سسک سسک کر رونے لگی۔

"بے وقوف! تم کہیں نہیں جاؤ گی۔" ناظم نے اسے غصّے سے دیکھا اور پھر آنکھیں بند کرلیں۔ وہ بڑی خاموشی سے گیلری میں پڑی ہوئی کرسی پر نیم دراز تھا۔

"بس اب گئی یہ کوٹھی، اپنے کوارٹر میں چلنے کی تیاری کرو۔ اب وہ ظالم ہمیں چین سے نہ رہنے دیں گے۔" مالک نے کچھ دن سے صبح بھی پینی شروع کردی تھی۔ اس لیے لڑکھڑا رہے تھے۔

"کون ظالم؟"

"وہ —— وہ تمھارے باپ، جن کی کوٹھی میں بیٹھے ہو۔" مالک زور سے چیخے۔ ناظم نے منہ پھیر لیا۔

"آپ اپنے کمرے میں چلیے مالک!" خالہ بی اُنھیں سہارا دے کر ان کے کمرے کی طرف چلیں تو سلیمہ بھی آگئی۔ اس کی آنکھیں سُرخ ہو رہی تھیں۔ اسکول، کالج، دفتر سب بند ہوگئے تھے۔

"تم بھی روکر آرہی ہو، سلیمہ بی! میں نے تو لوگوں کو گلیوں کوچوں میں دیواروں سے سر پھوڑ پھوڑ کر روتے دیکھا ہے۔" ناظم نے کہا، مگر سلیمہ نے کوئی

جواب نہ دیا۔

"اب کیا ہوگا بھائی میاں؟" کاظم نے پُوچھا۔ آج پہلی بار وہ ساجدہ کو ہراساں نظر آ رہا تھا۔ ایک لمحے کو اسے عجیب سا سکون محسوس ہوا۔

"ہاں! اب کیا ہوگا!" —— ناظم نے بڑی حقارت سے کاظم کو دیکھا "کیسی عجیب بات ہے کہ قائدِ اعظم کی وفات کے ساتھ اس ملک کے بے شمار لوگوں کو اس ملک کی موت اور تباہی نظر آ رہی ہے۔ لوگ یہ کیوں نہیں سوچتے کہ اس ملک کا وجود بہت سے لوگوں کی جدّوجہد کا نتیجہ ہے۔ صرف ایک راہنما کے بچھڑ جانے پر وُہ اپنی ہستیوں کو بھُول گئے۔ سوگ اپنی جگہ، مگر کیا یہ اس ملک کی بدنصیبی نہیں؟" ناظم تیزی سے اُٹھا اور گیلری کا دروازہ کھول کر باہر نکل گیا۔

ساجدہ اپنے کمرے میں جانے لگی تو اس نے دیکھا کہ تاجی دروازے کی آڑ میں کھڑی اب تک رو رہی تھی۔ ساجدہ نے پیار سے اس کے کاندھے پر ہاتھ رکھ دیا "مت رو تاجی! کچھ نہیں ہوگا، کچھ بھی نہیں۔ تم یہیں رہو گی، پاکستان میں۔ تم اپنی ماں کے پاس کبھی نہیں جاؤ گی۔"

تاجی کچھ بھی نہیں بولی، سر جھکائے آہستہ آہستہ قدم اٹھاتی چلی گئی اور ساجدہ اپنے بستر پر پاؤں لٹکا کر بیٹھ گئی۔ آج پہلی بار اسے ناظم کی باتیں اچھی لگی تھیں، اسے سکون سا محسوس ہوا تھا۔ اور پھر ایک دم اسے گامُو یاد آ گیا۔ چائے پیو گرم گرم، روٹی کھاؤ نرم نرم —— جس ملک میں ایسے لوگ رہتے ہوں اسے کون آنکھ اٹھا کر دیکھ سکتا ہے۔

ناظم نے محکمۂ بحالیات کی ملازمت سے استعفا دے دیا تھا اور اب کسی کالج میں پڑھا رہے تھے۔ کالج سے کبھی کبھار دوپہر کو کھانا کھانے گھر آجاتے تھے ورنہ عام طریقے سے غائب رہتے۔ رات کو آتے تو دو تین دوست ساتھ ہوتے اور تاجی انھیں کوس کوس کر چائے بناتی رہتی۔ اس معمول نے کاظم اور مالک کو سخت مایوس کیا تھا۔ سیاست پر گفتگو بند ہو گئی تھی۔ ادھر سلیمہ ناظم سے بات کرنے کو بھی ترستی تھی۔ مگر ساجدہ خوش تھی کہ چلو ہر دم کی بک بک سے تو نجات ملی۔

اب سردی بڑے زور سے پڑنے لگی تھی۔ رات کھانا کھا کر وہ سلیمہ کے کمرے میں چلی گئی اور یہ دیکھ کر حیران رہ گئی کہ روزانہ کی طرح سکون سے پڑھنے والی سلیمہ اپنے بستر پر اوندھی پڑی سسکیاں بھر رہی تھی۔

"سلیمہ باجی!" ساجدہ نے آہستہ سے پکارا "یہ کیا ہو رہا ہے؟"

"کچھ نہیں سجو! کچھ نہیں ——" وہ اپنے گرد لحاف لپیٹ کر بیٹھ گئی "تم بھی میرے پاس بیٹھ جاؤ"۔ اس نے لحاف کا ایک سرا ساجدہ کی طرف بڑھایا۔

"اب مجھے بتائیے کہ آپ کیوں رو رہی تھیں؟" ساجدہ نے لحاف پیروں پر ڈالتے ہوئے پوچھا۔

"یوں ہی، کبھی کبھی میرا جی چاہتا ہے کہ جی بھر کر روؤں، اگر میں نہ روؤں تو ایسا لگتا ہے کہ میرا کلیجہ پھٹ جائے گا۔"

"مگر کیوں باجی؟ ہر بات کی کوئی نہ کوئی وجہ تو ہوتی ہے۔"

"بعض باتیں ایسی ہوتی ہیں کہ انسان اپنے آپ سے کہتے ہوئے بھی گھبراتا ہے۔ ساری زندگی وہ ان سے بھاگتا ہے اور ——"

"پھر بھی وہ سائے کی طرح ساتھ لگی رہتی ہیں۔" ساجدہ نے کھوئے ہوئے لہجے میں کہا۔ وہ سوچنے لگی، دھوپ ڈھلتے ہی سائے جدا ہو جاتے ہیں، مگر یہ کیسے سائے ہیں جن کی جدائی کی دھوپ کبھی نہیں ڈھلتی۔

"کیا سوچنے لگیں؟" سلیمہ نے مسکرا کر اُسے دیکھا۔ اُس کے چہرے سے ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ اس موضوع کو ختم کرنے کی شعوری کوشش کر رہی ہے۔

"سلیمہ باجی! کیا آپ ناظم صاحب کو پسند کرتی ہیں؟" ساجدہ نے بڑے سرسری انداز سے یہ بات کہہ دی مگر اسے یہ احساس نہیں تھا کہ اس کا ردِّ عمل اتنا شدید ہو گا۔ ساجدہ کو اس نے اتنی حیرت اور حقارت سے دیکھا کہ وہ کانپ کر رہ گئی مگر وہ اس وقت تک ساجدہ کو ایسی ہی نظروں سے دیکھتی رہی جب تک کہ وہ مارے شرم کے رو نہ پڑی۔

"میں اپنی زندگی میں کسی مرد کا تصور بھی نہیں کر سکتی میرے لیے مرد اور عورت کا ازلی، ابدی رشتہ کوئی معنیٰ نہیں رکھتا، اس لیے پسند، ناپسند کا کوئی سوال نہیں پیدا ہوتا، سمجھ میں آیا ساجدہ بی بی؟" سلیمہ نے ساجدہ کے شانے پر ہاتھ رکھ دیا اور پھر نظریں جھکا لیں۔ اب وہ بالکل نارمل ہو گئی تھی۔ اس کے چہرے

پر اسی شرمندگی کے آثار تھے جو اس کی صورت کا نمایاں حصّہ بن گئے تھے۔ "میں سخت شرمندہ ہوں سجو! چلو اب آنسو پونچھ لو اور مجھے معاف کر دو۔"

"آپ مجھے اور شرمندہ کرنے کی کوشش کر رہی ہیں۔" وہ کھڑی ہو گئی "مجھے معاف کر دیجئے۔" اور وہ تیزی سے کمرے سے نکل گئی۔

اپنے کمرے کی تنہائی میں بیٹھ کر اس وقت وہ صرف سلیمہ کے لیے سوچ رہی تھی سلیمہ نے عورت اور مرد کے ازلی اور ابدی محبّت کے رشتے سے انکار کر دیا تھا — آخر کیوں؟ اور ابھی وُہ کچھ بھی نہ سوچ سکی تھی کہ تاجی آ گئی اور اپنے مخصوص انداز سے زمین پر بیٹھ گئی۔

"تم اتنی کمزور کیوں ہو رہی ہو تاجی؟" ساجدہ نے غور سے تاجی کو دیکھا۔ پھُولے پھُولے گال مرجھا گئے تھے اور کم پاور کے بلب کی روشنی میں وہ بہت پیلی نظر آ رہی تھی۔

"اتنی محنت کرتی ہُوں باجی! اتنی کہ اگر آپ کو ———" وہ ایک لمحے کو چُپ ہو گئی "خیر! کبھی تو ہمارے دن بھی پلٹیں گے۔ کہتے ہیں بارہ سال بعد گھورے کے دن بھی پلٹ جاتے ہیں، پھر میں تو انسان ہُوں۔" اس نے ٹھنڈی سانس بھری۔

"تم تو سب سے اچھّی انسان ہو، تمھارے دن ضرور پلٹیں گے تاجی!"

"ارے — رے! اب میں چلوں۔" وہ اس طرح اُٹھ کر تیزی سے دروازے کی طرف بڑھی جیسے کوئی بہت ضروری کام یاد آ گیا ہو۔

اب وُہ پھر تنہا تھی اور اداس۔ اس نے بڑی مشکل سے سلیمہ کی طرف سے

دھیان ہٹایا اور تپائی پر رکھی ہُوئی کتابیں اٹھالیں۔ جب سے اس نے کالج میں داخلہ لیا تھا، راتوں کو دیر تک جاگ جاگ کر پڑھتی رہتی مگر آج اس سے ایک لفظ بھی نہ پڑھا جا رہا تھا۔ وہ سوچنے لگی ناظم نے کالج کے اخراجات اپنے ذمّے لے کر کیا اس پر احسان کیا ہے یا اپنا فرض پُورا کیا ہے؟ آخر وہ اسے کیمپ سے لایا تھا۔ بہر حال وہ کسی احسان وحسان کو نہیں مانتی۔ جب اپنے پیروں پر کھڑی ہو جائیگی تو پائی پائی کا حساب چکا دے گی۔

اس وقت وہ نہیں پڑھ سکتی۔ اس نے جیسے تھک کر کتابیں تپائی پر رکھ دیں۔ ابھی تو پہاڑ جیسی رات پڑی تھی، نہ پڑھا جا رہا تھا، نہ نیند آ رہی تھی۔ اس نے سوچا، جانے سلیمہ کیا کر رہی ہو گی۔

وہ دروازہ بند کرنے کے لیے اُٹھی تو گیلری میں مالک کے ڈکرانے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ یہ آوازیں وہ روز رات کو سُنتی تھی اور ساتھ میں خالہ بی کی دبی دبی سِسکیاں بھی۔

وہ دروازہ بند کر ہی رہی تھی کہ تاجی آ گئی۔ ساجدہ نے سوچا چلو اچھا ہوا تھوڑا سا وقت کٹ جائے گا۔

تاجی نے بیٹھتے ہی سگرٹ سلگا لی اور لمبے لمبے کش لینے لگی۔

"تو تم سگرٹ لینے گئی تھیں تاجی؟ یہ اچھّی بات نہیں عادت پڑ جائے گی۔"

"میرے پاس دو آنے تھے۔ بازار سے منگوائی ہے باجی!" تاجی صاف جھُوٹ بول رہی تھی۔

ساجدہ نے اسے ذرا غور سے دیکھا تو وہ گھبرا کر اپنا جسم کمبل میں سمیٹنے لگی۔

"تاجی!" ساجدہ نے اسے ملامت بھری نظروں سے دیکھا۔

"آپ مجھے یوں کیوں دیکھ رہی ہیں باجی؟" وہ اس وقت بڑی معصوم لگ رہی تھی۔

"تم مجھے بہت اچھی لگتی ہو تاجی! میرا جی چاہتا ہے کہ تم سدا خوش رہو۔ جب میں کسی لائق ہو جاؤں گی تو کسی شریف آدمی کے ہاتھ میں تمھارا ہاتھ دے دُوں گی، اس دن خُوب ڈھول بجاؤں گی، مگر تم جس ہاتھ کو پکڑ رہی ہو، تاجی! وہ بہت بُرا ہے اور ———"

"دیکھیے باجی!" ——— وہ ایک دم غصّے سے لال بھبھوکا ہو گئی

"آپ میری بات میں دخل نہ دیں، میں نے کبھی آپ کی باتوں میں دخل دیا ہے؟ میں نے کبھی آپ سے پُوچھا ہے کہ ناظم میاں آپ کی پڑھائی کے دام کیوں دیتے ہیں؟" وہ بیحد تیکھی نظروں سے دیکھ رہی تھی۔

ساجدہ کو غصّہ آ گیا مگر وہ ضبط کر گئی۔ وہ بھلا تاجی کو کیسے سمجھا سکتی تھی اسے تاجی پر رحم آ رہا تھا "جاؤ تاجی! اب جا کر سو رہو، مجھے نیند آ رہی ہے۔"

"آپ سلیمہ باجی سے میری شکایت تو نہیں کریں گی، میں نے آپ سے بدتمیزی کی ہے۔" اب وہ ڈری ڈری نظروں سے دیکھ رہی تھی۔

"نہیں، مگر اب تم چلی جاؤ۔"

تاجی خاموشی سے چلی گئی۔ ساجدہ نے دروازہ بند کر دیا اور لحاف میں منہ چھپا کر پڑ رہی۔ آخر تاجی کو بھی تو ——— سب کچھ کہنے سننے کا حق ہے۔ وہ اتنی ہی بات کرے گی جتنا اس کا ذہن ہے ——— ساجدہ سوچتے سوچتے جانے کب سو گئی۔

رات کھانے کی میز پر گھمسان کا رَن پڑا۔ بات صرف اتنی تھی کہ خالہ بی کے آنسوؤں نے کچھ ایسا اثر دکھایا تھا کہ اب چند دنوں سے مالک صبح سے رات کے نو دس بجے تک بالکل ہوش و حواس میں ہوتے، اور یہی ہوش و حواس آج رنگ لا رہے تھے۔ انھیں جانے کیسے خیال آ گیا کہ ناظم نے محکمہ بجالیات کی ملازمت چھوڑ کر اس گھر کو ناقابلِ تلافی نقصان پہنچایا ہے، اور اب وہ نوکری چھوڑنے کی وجہ پوچھنے کے لیے بضد تھے اور ناظم تھا کہ خاموشی سے کھانا کھائے جا رہا تھا۔

"مجھے پتا ہے کہ تم گھر میں کسی سے نہیں بولنا چاہتے۔ سارا سارا دن غائب رہتے ہو، کچھ دن سے تمھارے ڈھنگ بہت نرالے ہیں، مگر میں آج پوچھ کر رہوں گا، تم نے اس گھر کو تباہ کرنے کی کوشش کیوں کی۔ ہمارا جائز حق کیوں چھینا؟"

"تو آپ سُن لیجئے کہ میں نے یہ نوکری اس لیے چھوڑی کہ اتنی چکر بازی، اتنی بے ایمانی، اتنی رشوت، اتنی کمینگی، اگر میں وہاں رہتا تو شاید پاگل ہو جاتا۔"

"بات ساری یہ ہے بھائی میاں! کہ آپ میں اتنی صلاحیت ہی نہ تھی کہ اسی محکمے میں رہتے۔ دُوسری بات یہ ہے کہ آپ یہ بھی نہیں چاہتے تھے کہ باغ اور دُوسری کوٹھی ہم لوگوں کو مل جائے۔"

"تم کوشش کرو کاظم! شاید تم کو وہاں نوکری مل جائے۔" سلیمہ نے طنزیہ لہجے میں کہا

"میں ایسی گھٹیا نوکریاں نہیں کرتا۔ مقابلے کے امتحان میں پاس ہو گیا تو پھر بتاؤں گا کہ کیا کچھ ہوتا ہے۔" کاظم نے فخر سے کہا

"کیا کرو گے، بس وہی، جو تم سے پہلے آنے والے کر رہے ہیں یا اس سے کچھ زیادہ۔ مگر یہ یاد رکھو کہ اس نظام کو تم لوگ بہت دن سہارا نہ دے سکو گے۔" ناظم نے بہت سکون سے کہا۔

"آپ یہ سب کچھ کھلے خزانے کیوں نہیں کہتے؟" ساجدہ نے کہا "یہ گھروں میں چھپ چھپ کر ——"

"کیوں؟ کیوں کہے کھلے خزانے، تم کون ہوتی ہو شہ دینے والی؟" خالہ بی ایک دم بگڑ اُٹھیں۔

ساجدہ اسی طرح سر جھکا کر پلیٹ کو انگلی سے نچانے لگی جیسے اس نے کچھ سُنا ہی نہیں۔

"زبان بندی کے لیے اتنے سیفٹی ایکٹ اور آرڈیننس جاری ہیں کہ سڑک پر کھڑے ہو کر اگر کسی کو زور سے آواز دی جائے تو حکومت اپنے خلاف نعرہ سمجھ کر پکڑ لے گی۔ مجھے جیل جانے کا کوئی شوق نہیں۔ جیل میں انسان بالکل بے بس ہو جاتا ہے اور پھر میں گاندھی جیسی ہمت کا مالک بھی نہیں۔"

"گاندھی بنے تو کوئی گاڈسے آپ کو گولی سے اڑا دے گا۔" کاظم نے زور سے قہقہہ لگایا۔

"کاظم! تم ہنس رہے ہو؟" "گاندھی کا قتل تاریخ کا ایک ایسا باب ہے جو ہمیشہ آنسوؤں سے تر رہے گا۔" سلیمہ نے اسے بڑی حقارت سے دیکھا۔

"واہ جی! آپ بھی بولنے لگیں"۔ کاظم نے بھی اسے حقارت سے دیکھا اور پھر زور سے ہنسا "بھائی میاں! جب گھر میں آپ کا جادو چل جاتا ہے تو آپ طالب علموں کے ذہنوں میں کتنا زہر بھرتے ہوں گے۔ ویسے آپ لافنگ بدھا کی طرح معصوم نظر آتے ہیں۔ مگر میں آپ کو جانتا ہوں، آپ دل سے پاکستان کے خلاف ہیں۔" کاظم اب بہت سنجیدہ ہو رہا تھا۔

"ہر تنقید کرنے والے کو غدار کہا جاتا ہے۔"

"تو پھر نکلیے نا سامنے!" کاظم نے جوش سے کہا

"فی الحال تو میرا کام ہے بچّوں کو علم سکھانا۔"

"خدا کے واسطے ناظم! یہ بکواس بند کرو، میں تم لوگوں کی سیاست بازی سے تنگ آ گیا ہوں، مجھے دُنیا سے کوئی واسطہ نہیں، جو ہونا ہے ہو، میں صرف سکون سے زندگی گزارنا چاہتا ہوں۔" مالک سخت بیزار نظر آ رہے تھے۔

"آپ نے ہمیشہ سکون سے زندگی گزاری ہے، مالک! آپ اپنے اردگرد سے ہمیشہ بے خبر رہے۔ آپ کی اتنی ہی دُنیا ہے جہاں تک آپ کی نظر پڑتی ہے اور بس۔ آپ کا رویّہ پاکستان کے حکمرانوں کی طرح ہے اور ——"

"بس، بس ناظم! تم کو شرم نہیں آتی اپنے باپ پر تنقید کرتے ہو، الٹی سیدھی باتیں کرتے ہو، حد ہے بے شرمی کی۔" خالہ بی غصّے سے سُرخ ہو رہی تھیں۔

"انھیں کچھ نہ کہئے خالہ بی! یہ بیچارے بے خبر آدمی ہیں، انھیں مسلمانوں کی فتوحات کی تاریخ کا بھی علم نہیں۔ یہ کل کی بات بھول جاتے ہیں۔ انھیں کشمیر کی فتح بھی یاد نہیں۔"

"اوہ میں بھول گیا تھا، تم اسی کشمیر کی بات کر رہے ہو جس کا تین چوتھائی حصہ ہندوستان کے پاس ہے۔" ناظم نے بہت آہستہ سے کہا اور پھر ایک دم چیخ پڑا۔ "تم جاہل ہو کاظم! جب تک میں یہاں بیٹھا ہوں تم کمرے سے نکل جاؤ۔"

"نکل جاؤ۔" کاظم نے جیسے اس کی نقل کی "اصل میں تو اس کوٹھی کا تالہ میں نے توڑا تھا، آپ میں اتنا زور کہاں، یہ گھر میرا ہے، آپ یہاں سے نکل جائیے۔" کاظم جیسے غصے سے دیوانہ ہو رہا تھا۔

ناظم نے زور سے کرسی کھینچی اور کمرے سے نکل گیا۔ ذرا دیر کے لیے سنّاٹا چھا گیا۔ سلیمہ آنکھیں پھاڑے دروازے کی طرف دیکھ رہی تھی۔ پھر وہ ایک دم مُڑی اور زور زور سے چیخنے لگی "تم کاظم! تم اتنے بے شرم ہو، تم اتنے کمینے ہو کہ حد نہیں، اپنے بھائی سے کچھ سیکھ نہیں سکتے تو کم از کم زبان تو قابو میں رکھو۔ میری ماں نے تم کو اس لائق بھی نہیں رکھا کہ شریفوں سے بات کرنے کا سلیقہ ہی سیکھ لیتے، اور آپ مالک، آپ، اس بدلگام کو ——"

"بس بس، سلیمہ باجی! میں آپ کا ادب کرتا ہوں، میری زبان نہ کھلوائیے، اپنے آپ کو پہچانیے، مالک نے آپ کو نہ پال لیا ہوتا تو آج ——"

"چُپ رہو بدتمیز ——" مالک چیخے، اور پھر ان کا غصہ جھاگ کی طرح بیٹھ گیا۔ میں کسی کو کیا روکوں گا۔ پاکستان آکر تو مجھے کچھ بھی نہیں ملا۔ بس وہ احترام ملا ہے جو

خدا کسی باپ کو نصیب نہ کرے۔" مالک کی آواز بھرا رہی تھی۔ امّاں بی جو خاموشی سے کھانا کھا رہی تھیں اُٹھ کر اپنے کمرے میں چلی گئیں۔

"آپ مالک! اتنا دُکھ نہ کریں، آپ کے دشمن روئیں۔" خالہ بی بچّوں کی طرح پھُوٹ پھوٹ کر رونے لگیں۔ ان کے چہرے پر ایسا کرب تھا جیسے ابھی ابھی لٹ کر بیٹھی ہوں۔

کاظم چپکے سے اُٹھا اور چلا گیا۔ سلیمہ روٹی کے ایک ٹکڑے کو یُوں ہی توڑ توڑ کر پلیٹ میں ڈال رہی تھی اور ساجدہ حیرت سے خالہ بی کے چہرے کو تک رہی تھی جن کے چہرے کو صرف مالک کے دُکھ کی پرچھائیاں اپنے حلقے میں لیے ہوئے تھیں۔ مالک کرسی کی پشت سے سر ٹکائے، آنکھیں بند کیے چپ چاپ آہیں بھر رہے تھے۔

"چلیے مالک! اپنے کمرے میں چل کر آرام کیجیے۔ بچّوں کی باتوں کو اتنی سنجیدگی سے نہیں لیتے۔" انھوں نے مالک کے شانے پر ہاتھ رکھ دیا۔ "جاؤ، تم دونوں لڑکیاں یہاں بیٹھی میرا منہ کیا تک رہی ہو!"

"مجھے نہیں معلوم کہ میں کس کو صحیح کہوں اور کسے غلط۔" گیلری میں چلتے ہوئے سلیمہ آہستہ آہستہ کہنے لگی "تقسیم سے پہلے جب ہم تین کمروں کے سرکاری کوارٹر میں رہتے تھے تو اس سے کہیں بہتر تھے۔ سب کچھ جانتے ہوئے بھی کوئی زبان نہ کھولتا تھا، خاندان اور پڑوس کے خیال سے کوئی بھی اُونچی آواز سے نہ بولتا تھا کاظم مجھے چھیڑتا، ستاتا اور عجیب عجیب باتیں کرتا تھا مگر میں اسے ایک لفظ نہ کہتی تھی۔ مجھے بولتے ہوئے خوف لگتا تھا، مگر اب یہاں نہ کوئی پڑوس ہے

نہ خاندان کے افراد"—— وہ ٹھنڈی سانس بھر کر خاموش ہو گئی اور پھر اپنے کمرے میں داخل ہو گئی" اچھا، خدا حافظ سجّو! پتا نہیں ناظم بھائی کہاں ہونگے۔ جاؤ، سو رہو، کافی رات ہو گئی۔" اس نے دروازہ اندر سے بند کر لیا اور ساجدہ تھکے تھکے قدم ڈالتی اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئی۔

آج کل ساجدہ کو کالج میں ایک جانا پہچانا چہرہ نظر آرہا تھا۔ جب وُہ آدھی چھٹّی پر کلاس سے باہر نکل کر برسوں پرانے پیپل کے درخت تلے آبیٹھتی تو وہ چہرہ کئی لڑکیوں کے ساتھ اس کے سامنے سے گزر جاتا۔ ساجدہ کا جی چاہتا کہ وہ اس سے بات کرے مگر ہمت نہ پڑتی، اگر وہ انوری نہ ہُوئی تو اتنے خوبصورت کٹے ہُوئے بال اور قیمتی لباس۔ اس نے تو صرف آٹھویں کلاس تک انوری کے ساتھ پڑھا تھا۔ پھر انوری نے اسکول چھوڑ دیا تھا۔ ان دنوں اس کے کپڑے بڑے گھٹیا ہوتے تھے۔ چوٹی ایسے کس کر گندھی ہوتی کہ پیٹھ پر دم کی طرح مڑ جاتی۔ انوری کے ابّا سارے محلّے کا پانی بھرتے تھے۔ آنے میں دو مشکیں سُرخ موٹے کپڑے کو گھونگھٹ کی طرح چہرے پر ڈالے وہ ساجدہ کے گھر میں داخل ہوتے تو وہ انوری کو پُوچھنا نہ بھُولتی۔ کلّو بابا بڑے فخر سے کہتے "بیٹیا! میں نے اسے پڑھے بٹھادیا ہے۔ بھلے برادری مذاق اڑائے۔ دنیا کی آنکھیں بہت پھٹ گئی ہیں جوان لڑکی کو دیکھ کر سیٹی مارتے ہیں۔ اب وہ پراوٹ (پرائیویٹ) دسویں کا امتحان دے گی۔ مجھے بڑا سوق ہے بٹیا کہ وُہ بہت پڑھے، میں برادری میں سر اونچا کر کے چلوں ـــــ"

"وہ بہت پڑھے گی بابا! انوری تو بہت ذہین ہے۔" ساجدہ کہتی اور بابا اپنی سرخ گھونگھٹ میں ہنستے ہوئے چلے جاتے۔

مگر جب وہ جانا پہچانا چہرہ تنہا جیسے کچھ تلاش کرتا اُس کے سامنے سے گزرا تو ساجدہ اپنی جگہ سے اُٹھی اور پیچھے سے جا کر اس کے شانے پر ہاتھ رکھ دیا۔ چہرے نے مڑ کر دیکھا۔

"تم انوری ہو نا؟ میں ساجدہ ہوں، یاد ہے نا؟ ہم دونوں گلی میں ساتھ کھیلتے تھے، پھر ایک ہی اسکول میں آٹھویں تک پڑھتے رہے۔" ساجدہ اسے بڑے پیار سے دیکھ رہی تھی مگر انوری کے چہرے کا رنگ ایک دم بدل گیا تھا۔ وہ اتنی مظلوم نظر آ رہی تھی جیسے کوئی گناہ کرتے پکڑی گئی ہو۔ اس کی آنکھوں سے ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ ساجدہ کی یادوں کے ڈھیر میں آگ لگا کر بھاگ جانا چاہتی ہے۔

"جی وُہ میں ــــ میں ــــ" انوری سے کچھ نہ کہا گیا

"اری تُو تو خواہ مخواہ گھبرا گئی۔ مجھے نہیں پہچانتی، میں ساجدہ ہوں۔ کلّو بابا کیسے ہیں؟ تم یہاں کس کلاس میں پڑھ رہی ہو؟" اس نے انوری کے ہاتھ پر موٹا سا مسّہ بھی دیکھ لیا تھا۔ اس مسّے کو دبا کر وہ انوری سے اپنی بات منوایا کرتی تھی۔

"ابّا اچھے ہیں۔ یہاں ایک اسٹور ہے جس پر نوکر کام کرتے ہیں۔ اور باجی! ایک کپڑے کی مل ہے۔ ابّا نے بہت محنت کی ہے۔ ہم نے ایک کوٹھی بھی بنوائی ہے اور باجی! ــــ

یہ ٹھاٹ ہیں انوری! ویسے تم بہت پیاری ہو گئی ہو، بہت خوبصورت لگنے لگی ہو، مگر تم مجھ سے مل کر ذرا بھی خوش نہیں ہوئیں، امیر

ہوگئی ہو نا؟"

"نہیں باجی! مجھے ڈر لگتا ہے، یہاں کوئی نہیں جانتا کہ میں بہشتی کی بیٹی ہوں۔ یہاں سب یہی جانتے ہیں کہ مَیں ایک مِل اونر کی بیٹی ہوں۔ باجی! ابا نے تو اپنا نام بھی بدل لیا ہے۔ اب وُہ سرور حسین ہیں۔ باجی! آپ کسی سے کہیں گی تو نہیں؟" اس کی آنکھوں میں التجا کروٹیں لے رہی تھی۔

"تم اطمینان رکھو، میں کسی سے کچھ نہ کہوں گی۔" ساجدہ نے اس کا پیار سے تھاما ہُوا ہاتھ چھوڑ دیا۔ "انوری! دنیا میں اور کوئی کام نہیں جو تمھاری ذاتی زندگی میں دخل دیتی پھروں۔" ساجدہ نے جی ہی جی میں فیصلہ کر لیا کہ اب وہ انوری سے نہیں ملے گی۔

"باجی! آپ بُرا مان گئیں۔ دیکھیے نا مشکیں اٹھا کر ابّا کی کمر ٹیڑھی ہوگئی۔ اللہ نے پاکستان بنایا تو ہمارے دن پھرے، یہاں کوئی کسی کو نہیں جانتا۔ برادری کے کچھ لوگ کراچی میں ہیں، باقی دہلی میں، کچھ مر کھپ گئے۔ اب کوئی کلو بہشتی کو یاد کرنے والا نہیں۔ بیسیوں نوکر جی حضور کرتے پھرتے ہیں۔" اس کے لہجے میں فخر تھا۔

اس کی سہیلیاں اسے تلاش کرتی ادھر آ رہی تھیں۔ وہ دوڑ کر ان کے پاس چلی گئی۔

آج دس بارہ دن ہو گئے تھے اور ناظم گھر نہیں آیا تھا۔ سب پریشان تھے۔ خالہ بی تڑپی تڑپی پھرتیں۔ سلیمہ کتابیں سامنے رکھے کسی اور طرف دیکھتی رہتی۔ اماں بی مشکل سے دو چار نوالے کھاتیں۔ مالک باغ اور کوٹھی کی بات جیسے بھول ہی گئے تھے۔ بس ایک کاظم تھا جو خوش نظر آتا۔ وہ سب کو چھیڑ چھیڑ کر باتیں کرتا اور سلیمہ اسے بار بار جھڑکتی۔

ناظم کے جانے کے بعد ساجدہ کو بھی محسوس ہو رہا تھا کہ کاظم کی نظروں میں بڑی بے باکی آگئی ہے۔ وہ برابر سوچ رہی تھی کہ اس گھر کو لگام دینے کے لیے ناظم کی موجودگی ضروری ہے۔ ویسے اسے ناظم کے جانے کے بعد کوئی کمی نہ محسوس ہو رہی تھی۔ ناظم سے نفرت کی بنیاد کو وہ آج تک نہ پاٹ سکی تھی۔

رات کھانے کی میز پر سلیمہ نے ہنگامہ کر دیا —— "جاؤ نا، جا کر ناظم بھائی کو تلاش کرو وہ کہاں ہیں۔ مزے سے دونوں وقت گلے گلے تک ٹھونس کر کھاتے ہو۔" وہ کاظم کو کھا جانے والی نظروں سے دیکھ رہی تھی۔

"تلاشِ گمشدہ کا اشتہار دے دوں سلیمہ باجی؟" اس نے زور سے قہقہہ لگایا۔

"میں —— میں تمھارا سر توڑ دوں گی کاظم!" وہ غصّے سے بولائی بولائی لگ رہی تھی۔ سب حیرت اور پریشانی سے سلیمہ کو دیکھ رہے تھے۔

"آپ میرا سر تو کیا ایک انگلی بھی نہیں توڑ سکتیں سلیمہ باجی! میں آپ کا ادب کرتا ہُوں مگر اس کا یہ مطلب نہیں کہ آپ میرے سر پہ ——" کاظم بھی اب غصّے سے لال بھبھوکا ہو رہا تھا۔ مالک کھانا چھوڑ کر اپنے کمرے میں چلے گئے۔ جب سے ناظم گیا تھا انھوں نے پھر سرِ شام پینا شروع کر دی تھی۔ نشہ نہ صرف انسان کو ڈرپوک بنا دیتا ہے بلکہ وہ اپنی شخصیت کو بھی بھُول جاتا ہے۔ خود کو منوانے کی صلاحیت دم توڑ دیتی ہے۔

"بدتمیز، بیہودہ! میں نے اگر زندگی میں تم کو نہ ٹھیک کیا تو اپنا نام بدل ڈالوں گی۔"

"تو پھر آپ جلد از جلد اپنا نام بدل ڈالیں اس لیے کہ آپ کچھ بھی نہیں ہیں۔" کاظم نے کھڑے ہو کر زور سے کرسی کھینچی۔

خالہ بی اب تک اس طرح بیٹھی تھیں جیسے ان سے قوّتِ گویائی چھین لی گئی ہو اُنھوں نے بڑی مشکل سے اپنے دونوں ہاتھ اٹھا کر اپنے سر پہ رکھ لیے "تم لوگ مجھے مارو، تم لوگ مجھ سے بدلے لو، مجھ سے بدلے لو —— مجھ سے۔" وہ ایک دم پھُوٹ پھُوٹ کر رونے لگیں۔

"مجھے تم سے نفرت ہے نفرت۔" سلیمہ نے زمین پر تھوک دیا۔

"یہاں سے چلیے سلیمہ باجی! اُٹھیے۔" ساجدہ نے سلیمہ کو زبردستی کرسی سے کھینچ کر کھڑا کیا۔

"تم بیچ میں دخل نہ دو منشی کی اولاد۔" کاظم غرّایا۔

"بس اتنی سی بات!" ساجدہ ہنسی "میں تو ایک سچّے حساب داں کی بیٹی ہوں اور اپنے باپ پر فخر کرتی ہوں، مگر تمھارے پاس تو فخر کرنے کو کچھ بھی نہیں ہے۔"

"تم میرے باپ پر حملہ کر رہی ہو!" کاظم ساجدہ کی طرف جھپٹا تو اماں بی نے، جو اب تک خاموشی سے بیٹھی سب کچھ سُن رہی تھیں، اُٹھ کر کاظم کو گریبان سے پکڑ لیا "بہنوں پر ہاتھ اٹھائے گا!"

"میں سمجھ لوں گا، میں سمجھ لوں گا ——"

وہ سلیمہ کو اس کے کمرے کی طرف لے کر جا رہی تھی۔ کاظم چیخے جا رہا تھا سلیمہ کو بستر پہ لٹا کر اس نے اندر سے دروازہ بند کر لیا۔

سلیمہ گھٹ گھٹ کر رو رہی تھی۔

"چُپ ہو جائیے باجی! بھلا آپ بھی اس دیوانے کی باتوں پہ روتی ہیں!"

"وہ دیوانہ نہیں ببّو! تم نہیں جانتیں اس نے مجھے کتنے عذاب دیئے ہیں! جانے ناظم کہاں ہوں گے، انھیں کھانے پینے کی کتنی تکلیف ہو گی۔ جب پاکستان بنانے کی تحریک چل رہی تھی تو ناظم نے اس میں دن رات حصّہ لیا، اس وقت کاظم، مالک اور میری ماں ہر وقت یہ کہتے تھے کہ وہ سب کو گھر سے بے گھر کرنے کے لیے اس تحریک میں حصّہ لے رہا ہے اور اب پاکستان کی لوٹ کھسوٹ سے پیٹ بھر بھر کر یہ بھی برداشت نہیں کر سکتے کہ کوئی تنقید کا ایک لفظ بھی زبان سے نکالے۔" سلیمہ اب تک سخت غصّے میں تھی۔

"اب آپ سو جائیں باجی! بس سب کچھ بھول جائیے۔" ساجدہ نے پیار سے سلیمہ کی سوجی ہوئی آنکھوں پر ہاتھ رکھ دیئے "سو جائیے باجی!"

سلیمہ نے کروٹ لے کر آنکھیں بند کر لیں تو وہ اپنے کمرے میں آ گئی۔ تاجی زمین پر سر نیوڑھائے بیٹھی تھی۔

"آپ آ گئیں ساجدہ باجی! کب سے یہاں بیٹھی آپ کا انتظار کر رہی ہوں، آج تو میں نے برتن بھی نہیں دھوئے، میز پر سے اٹھا کر یوں ہی دھر آئی ہوں۔" وہ غصے سے منہ پھلائے ہوئے تھی۔

"کیا ہو گیا؟" ساجدہ کا لہجہ سخت تھا، اسے تاجی کی موجودگی بہت بری لگ رہی تھی۔

"ایک تو اتنا کام کرو، اس پر سے ہر وقت لڑائی جھگڑے۔ اس گھر میں ایک کاظم میاں ہیں جو ذرا ہنستے بولتے ہیں۔ وہ بھی آپ کو اور سلیمہ باجی کو برا لگتا ہے۔ آپ سلیمہ باجی کا ساتھ نہ دیا کریں ساجدہ باجی!"

"فضول باتیں نہ کرو، مجھے نیند آ رہی ہے، جاؤ یہاں سے۔"

"سو جائیے، میں کون سا آپ کو جگانے بیٹھی ہوں۔" وہ بڑبڑاتی چلی گئی۔

ساجدہ دروازہ بند کرنے کے لیے اٹھی تو خالہ بی کے زور زور سے بولنے کی آواز آنے لگی، ان کی آواز خوشی سے تھر تھرا رہی تھی "تم کہاں چلے گئے تھے ناظم! تم نے اتنا بھی نہ سوچا کہ میرا کیا حال ہو گا، سلیمہ پر کیا گزرے گی، وہ تو اس گھر میں صرف تم سے ہی بات کرتی ہے، باقی سب تو ـــــــــ"

"کہاں ہے سلیمہ؟" ناظم کی آواز آئی۔

"اپنے کمرے میں ہو گی۔"

ساجدہ نے عجیب سا سکون محسوس کرتے ہُوئے دروازہ بند کر لیا۔

شام سے بادل گھر کر آ گئے تھے اور اب اچانک زور زور سے گرجنے لگے تھے جاتی ہوئی سردی پھر سے چمک گئی تھی۔ کھڑکی سے ہوا کے سرد جھونکے اندر آ رہے تھے وہ کھڑکی بند کرنے کو اٹھی تو باہر برآمدے کی طرف آتے ہوئے دو سائے دیکھ کر اس کا جی بیٹھنے لگا۔ اس نے سوچا، بہت دن نہیں گزریں گے کہ تاجی کا سایہ راتوں کو اکیلے بھٹکتا پھرے گا۔ دُوسرا سایہ اس طرح کھو جائے گا کہ وُہ کبھی نہ ڈھونڈھ سکے گی ——— تاجی اب گیراج کی طرف سے اپنے کوارٹر میں جا رہی تھی اور گیلری کا دروازہ اندر سے بند کرنے کی آواز صاف سنائی دے رہی تھی۔

کھڑکی بند کر کے وہ بستر پر لیٹ گئی اس نے پڑھنے کے لیے سوچا ہی تھا کہ کوئی اس کے کمرے کے دروازے کو ہولے ہولے کھٹکھٹا رہا تھا۔ اس نے سوچا سوائے تاجی کے اور کون ہو سکتا ہے، اسی کو آج کل نیند کی کمی کی شکایت ہے۔

دروازہ کھولا تو سامنے ناظم کھڑا تھا۔ ساجدہ گھبرا گئی۔

"ساجدہ بی! آپ ٹھیک ٹھاک ہیں نا؟ مجھے افسوس ہے کہ میری وجہ سے آپ سب لوگ پریشان رہے۔" اس نے باہر کھڑے کھڑے آہستہ آہستہ کہا ——— "اور سلیمہ تو صرف مجھ سے مانوس ہے۔ مجھے دیکھ کر خُوب روئی۔"

"مگر میں تو آپ سے مانوس نہیں، آپ خواہ مخواہ میری فکر کرتے ہیں۔" ساجدہ نے بہت سکون سے جواب دیا۔

"ٹھیک ہے۔ پھر بھی میرا فرض تھا کہ میں اتنے دن بعد آیا ہُوں تو آپ کو

پوچھوں۔ میں آپ کو اِس گھر میں لایا ہُوں اس لیے میری خواہش ہے کہ آپ کو کبھی کوئی تکلیف نہ ہونے دُوں۔"

"جب میں یہاں آئی تھی" اس نے ایک لمحے کو رُک کر ناظم کی طرف دیکھا۔ "وہ بہت منحوس گھڑی تھی ناظم صاحب!" ساجدہ کی آواز بھرا گئی۔

بادل ایک بار بڑے زور سے گرجے۔ ساجدہ کو اگر کسی چیز سے خوف محسوس ہوتا تھا تو وہ بادلوں کی گرج تھی۔

ناظم ایک لمحے تک اِس کی طرف دیکھتا رہا اور پھر چلا گیا۔ ساجدہ نے دروازہ بند کر لیا اور لحاف میں اس طرح منہ چھپا کر لیٹ گئی جیسے اب گرج چمک سے محفوظ ہو گئی ہو۔

آٹھ دس دن سے تاجی کی طبیعت اتنی خراب تھی کہ وہ اپنے کوارٹر سے بھی نہ نکلی تھی۔ کئی کئی بار ساجدہ اس کے کوارٹر میں جاتی، نبض ٹٹولتی، ماتھے پر ہاتھ رکھتی مگر نہ تو اسے بخار تھا، نہ زکام۔ پھر بھی وہ اتنی دُبلی ہو رہی تھی کہ رخساروں کی ہڈیاں نکل آئی تھیں۔ خالہ بی نے اب تک اسے ڈاکٹر کو نہ دکھایا تھا، جانے کیا اُلا بُلا کُوٹ چھان کر پلا دیتیں۔ ساجدہ یہ سوچ سوچ کر حیران ہوتی کہ یہ عورت صرف چند روپے بچانے کے لیے اپنے آپ کو کتنے عذاب میں مبتلا کیے ہوئے ہے۔ باورچی خانے کا سارا کام اُنھوں نے اپنے ذمّے لے لیا تھا۔

آج جب مہترانی گھر کے کام سے فارغ ہو گئی تو خالہ بی اسے اپنے ساتھ لے کر اپنے کمرے میں چلی گئیں۔ ساجدہ نے بڑی حیرت سے یہ منظر دیکھا۔ خالہ بی تو اسے نیچ سمجھ کر سیدھے مُنہ بات بھی نہ کرتی تھیں۔

"سلیمہ باجی! آج خالہ بی بہت ترقی پسند ہو گئی ہیں۔" ساجدہ نے کمرے میں جھانک کر ہنستے ہوئے کہا۔

"کیسے سجو؟"

"وہ مہترانی کو اپنے کمرے میں لے گئی ہیں اور اس سے باتیں کر رہی ہیں۔"

"کسی مولوی کی تلاش ہو گی!" سلیمہ نے نفرت سے ہونٹ سکوڑ لیے۔ "وہ اس سے معلوم کر رہی ہوں گی کہ وہ کسی مولوی کے گھر کام کرتی ہے یا نہیں، اگر کرتی ہے تو انھیں لے کر آئے۔ پھر مالک کے لیے ایک اور تعویذ لکھوایا جائے تاکہ وہ شراب چھوڑ دیں اور ابد تک زندہ رہیں ——————"

ساجدہ کو خالہ بی پر رحم آنے لگا —— خاندانوں کے غلط فیصلوں کو قبول کرنے والے بزدل بعض وقت کتنے بڑے بڑے المیے جنم دیتے ہیں۔ کیسی آگ لگا دیتے ہیں کہ جلنے کی بو بھی نہیں آتی اور جانے کیا کچھ جل کر راکھ کا ڈھیر بن جاتا ہے۔

"سلیمہ باجی! ابا جی کب سے بیمار ہے۔ بیچاری خالہ بی روز کھانا پکاتی ہیں۔ چلیے آج ہم دونوں پکا لیں۔ آج کی چھٹی اس نیک کام میں گزار دیں۔"

"قطعی نہیں، ہم لوگ گھی زیادہ خرچ کریں گے، آٹا ٹھیک سے چھانے بغیر بھوسی پھینک دیں گے۔ مالک کی کمائی ہوئی جمع جتھا کو اس طرح نہیں لٹایا جا سکتا۔ اس لیے جا کر کوئی اور نیک کام کرو اور مجھے ناول ختم کرنے دو، بہت دلچسپ ہے۔"

خالہ بی نے آج سرِ شام ہی شور مچا دیا تھا کہ سب لوگ جلدی کھانا کھا لو۔ بادل گھر گھر آ رہے ہیں، کیا پتا بارش ہونے لگے۔ سب کے انکار کے باوجود انھوں نے میز پر پلیٹیں لگا دیں اور سب کو آوازیں دے دے کر بلانا شروع کر دیا، تو جیسے سب مجبوراً کھانے کے لیے بیٹھ گئے۔

ساجدہ نے اماں بی کا کھانا پلیٹ میں نکالا اور ان کے کمرے میں دے آئی۔

انھوں نے اس دن سے سب کے ساتھ کھانا کھانا چھوڑ دیا جب سے کاظم اور ناظم کی لڑائی ہوئی تھی۔

ساجدہ جب آرام سے اپنی کُرسی پر بیٹھ گئی تو اس نے اُچٹتی سی نظر سے سب کی طرف دیکھا۔ خالہ بی تھکی تھکی سی تھیں اور جانے کیوں کاظم فکرمند سا نظر آرہا تھا۔ اس کا چہرہ تمتمایا ہوا تھا۔ ناظم ویسے ہی سب سے بے تعلّق سے نظر آتے، کوئی بات کرتا تو ہوں ہاں کرکے ٹال جاتے۔ بہت عرصے سے کھانے کی میز پر سوگوار سی نظر آتی۔ کاظم لاکھ چھیڑتا مگر ناظم اور سلیمہ جواب نہ دیتے۔

"تم میری جان! آج چپ کیوں ہو؟ میری زندگی میں تو تم ہمیشہ بچّوں کی طرح ہنستے کھیلتے رہو۔ تم کو کاہے کی فکر ہو۔" خالہ بی کاظم کی پلیٹ میں اچھی اچھی بوٹیاں چُن چُن کر ڈال رہی تھیں۔

"میرے بیٹے کو پڑھائی نے نڈھال کر دیا ہے"۔ مالک نے پیار سے کاظم کو دیکھا۔ کھانے سے پہلے ایک آدھ گھونٹ پی آئے تھے اس لیے چہرے سے مسرّت برس رہی تھی۔

"بادل چھائے ہوں، ہوا سائیں سائیں چل رہی ہو تو بھی لوگ رنجیدہ ہو جایا کرتے ہیں۔ موسم کا اثر تو پڑتا ہے نا۔ اس لیے ہماری امّی زیادہ فکرمند نہ ہوں تو اچھا ہے۔" سلیمہ کے لہجے میں اتنا طنز تھا کہ خالہ بی کے ہاتھ سے نوالہ چھوٹ گیا۔ مگر وہ یوں ہی ہنسنے لگیں۔ کاظم نے سلیمہ کی طرف دیکھا اور پھر بے دلی سے کھانے لگا۔

"بھئی سب لوگ جلدی جلدی کھاؤ۔ اگر بارش ہونے لگی، تو سردی

بڑھ جائے گی، برتن دھونے مشکل ہو جائیں گے۔" وُہ بڑے بڑے نوالے جیسے نگلنے لگیں۔ کاظم بھی ان کے حکم پر بڑی سعادت مندی سے عمل کر رہا تھا۔

کیا واقعی سخت سردی پھٹ پڑی ہے۔ اس نے تو سویٹر بھی نہیں پہنا۔ شاید اس کی کھال بہت موٹی ہے اس لیے اسے سردی نہیں لگ رہی۔

سلیمہ اور ناظم کے سوا سب تیزی سے نوالے توڑ رہے تھے۔ سب سے پہلے کاظم نے کھانا ختم کیا اور کمرے سے چلا گیا۔

سلیمہ کے سوا سب نے کھانے سے ہاتھ اُٹھا لیا۔ وُہ بڑے آرام سے چھوٹے چھوٹے نوالے کھا رہی تھی۔

"میں نے کہا سلیمہ بیٹی! ذرا جلدی سے ———" خالہ بی نے گھگیاتے ہُوئے بات ادھوری چھوڑ دی۔

"آپ کو ایسی ہی جلدی ہے تو میں نہیں کھاتی۔" سلیمہ تیزی سے اُٹھی اور کمرے سے نکل گئی۔

"کوئی میں نے یہ تھوڑا ہی کہا تھا کہ وہ کھانا چھوڑ دے۔" خالہ بی کی آواز بھرا گئی۔ "وُہ میری ہر بات کو غلط سمجھتی ہے۔"

انھوں نے جلدی جلدی پلیٹیں اٹھانی شروع کر دیں "میرا تو خیال ہے کہ بُوندا باندی شروع ہو گئی ہے، سوندھی سوندھی خوشبو اڑ رہی ہے۔ خدا میرے بچّوں کو سردی سے محفوظ رکھے۔ یہ جاتی ہوئی سردی بڑی خطرناک ہوتی ہے۔"

"یہ سردی آج کچھ زیادہ ہی خطرناک ہو رہی ہے۔" ناظم نے آہستہ سے کہا۔ مگر خالہ بی تو پلیٹوں کا انبار اٹھائے کمرے سے باہر جا رہی تھیں۔

ناظم نے ساجدہ کو ذرا غور سے دیکھا تو وُہ گھبرا گئی۔ اس نے سوچا موسم واقعی خطرناک ہے۔ اس نے سلیمہ کے کمرے میں جاکر سکون سے سانس لی۔

خالہ بی برتن رکھ کر واپس آئیں تو یہ دیکھ کر بپھر گئیں کہ ناظم اور ساجدہ سلیمہ کے کمرے میں بیٹھے ہیں اور سلیمہ آج کی بارش پر تبصرہ کر رہی ہے۔

"میں نے کیا کہا تھا، یہی نا کہ تم سب لوگ اپنے اپنے کمروں میں جا کر اوڑھ لپیٹ کر بیٹھو۔" خالہ بی نے دروازے پر کھڑے کھڑے کہا "کیا تم لوگ میری اتنی ہی عزت کرتے ہو کہ میری بات کو مذاق میں اڑا دو۔"

"بس خالہ بی! ہم لوگ سونے کی تیاری کر رہے ہیں۔ یُوں ہی دو منٹ کو بیٹھ گئے تھے۔ واقعی آج سردی پڑ رہی ہے۔" ناظم نے بیحد مدھم لہجے میں کہا اور پھر کرسی کھسکا کر کھڑا ہو گیا۔

"اور ہاں ناظم میری جان! تم پھاٹک بند کرنے نہ جانا، ہوا بیحد ٹھنڈی ہے میں خود ہی بند کر لُوں گی۔"

"شکریہ خالہ بی! شب بخیر سلیمہ!" وہ اپنے کمرے کی طرف چل دیا۔ ساجدہ بھی جانے کے لیے دروازے کی طرف بڑھی تو ایک بار بڑے زور سے بادل گرجے۔

"ساجدہ! تم اپنے کمرے کی کھڑکی بند کر لینا اور شیشوں کو اچھی طرح پردوں سے چھپا دینا۔ بجلی چمکتی ہے تو خواہ مخواہ ہول آنے لگتا ہے۔"

ساجدہ نے پردے کھینچ دئیے مگر لائٹ بند نہ کی۔ اسے یہ ساری ہدائتیں آج بہت عجیب لگ رہی تھیں۔ کل رات بھی بادل گرجتے رہے تھے۔ بجلی زور زور سے چمکتی رہی تھی لیکن خالہ بی کو ذرا بھی فکر نہ ہوئی تھی۔

وہ کتاب اٹھا کر پڑھنے کی کوشش کرنے لگی تو خالہ بی کی خصوصی توجہ کو بھول گئی اور پڑھتے پڑھتے جانے کب سو گئی۔

بادلوں کی دھمک سے بار بار اس کی آنکھ کھل جاتی۔ ایک بار تو اس کی نیند یوں غائب ہوئی کہ وہ کروٹیں بدل بدل کر تھک گئی کھڑکی بند ہونے کی وجہ سے کمرے میں امس ہو رہی تھی۔ اس نے اُٹھ کر کھڑکی کا ایک پٹ کھول دیا۔ باہر نظر پڑتے ہی وہ حیرت زدہ رہ گئی۔ رات کا ایک بج رہا تھا اور خالہ بی پھاٹک بند کر کے گیراج کی طرف جا رہی تھیں۔ اسے سخت وحشت ہونے لگی۔ کیا تاجی کی طبیعت زیادہ خراب ہے! وہ ضرور اسی کے پاس گئی ہیں اور کیا پتا وہ کام ختم کر کے اسی کے پاس بیٹھی رہی ہوں۔ ڈاکٹر کو دام خرچ ہونے کے ڈر سے نہیں بلا سکتیں۔ رات رات بھر جاگ کر اپنی صحت خراب کر سکتی ہیں۔ یہ انسان بھی عجیب شے ہے اس کی شخصیت میں اتنی پرتیں ہوتی ہیں کہ کھول کھول کر تھک جاؤ پھر بھی تھاہ نہ ملے۔

صبح جب وہ سو کر اُٹھی تو ہاتھ منہ دھوئے بغیر تاجی کو دیکھنے چلی گئی۔ وہ برسوں کی بیمار معلوم ہو رہی تھی۔ ایسا لگتا تھا کہ رات اس نے سکرات کے عالم میں گزاری ہے۔ اس کے پپوٹے سوجے ہوئے تھے اور ہونٹوں پر پپڑیاں پڑی ہوئی تھیں، کوارٹر میں ایسی سسا ہند پھیلی ہوئی تھی جیسے کسی نے کچا کچا خون چھڑکا ہو۔

"تاجی!" ساجدہ نے اس کی پیشانی پر ہاتھ رکھ دیا۔ وہ برف کی طرح ٹھنڈی ہو رہی تھی۔

تاجی نے آنکھیں کھول دیں اور جیسے بڑی مشکل سے ساجدہ کو دیکھا۔

"ٹھیک ہُوں باجی!" اس کی آواز ڈوبی ڈوبی لگ رہی تھی۔

"بالکل ٹھیک ہو، مجھے تو معلوم نہ تھا کہ تم اتنی بیمار ہو۔" ساجدہ اس کی پیشانی سہلانے لگی۔ "اگر مجھے معلوم ہوتا تو رات تمھارے پاس گزارتی۔"

تاجی نے ایک لمحے کو چھت کی طرف فریادی نظروں سے دیکھا اور پھر دو آنسو اس کے پیلے رخساروں پر بہہ گئے۔ اس نے آنکھیں بند کرلیں اور میلا لحاف چہرے پر کھینچ لیا۔

"تاجی! میں تمھارا سر دبادُوں؟" ساجدہ نے اس کا لحاف آنکھوں پر سے سرکایا، مگر نہ تو اس نے آنکھیں کھولیں اور نہ بولی۔ ساجدہ ذرا دیر کھڑی رہی اور پھر چلی آئی۔ اسے کالج جانے کے لیے ابھی تیار بھی ہونا تھا۔

دس پندرہ دن بعد تاجی بھلی چنگی ہو کر گھر کے کاموں میں جُت گئی مگر اب اس میں پہلے کی طرح کھلنڈرا پن نہ رہا تھا۔ اس کا گول گول چہرہ کھویا کھویا تھا۔ اس لیے خواہ مخواہ اچھی لگنے لگی تھی لیکن اب چاہے دن میں فرصت ملے یا رات کو، وہ ساجدہ کے پاس آکر نہ بیٹھتی تھی۔ آج دوپہر کو جب وہ کورس کی کتابوں سے سر مار رہی تھی تو ایک دم تاجی آگئی، اپنے مخصوص انداز سے زمین پر پھیل کر بیٹھ گئی اور سگریٹ کے ٹوٹے کو جلا کر زور زور سے کش لینے لگی۔

ساجدہ نے کتابیں ایک طرف رکھ دیں "اب تو تم بالکل ٹھیک ہو، تاجی! چہرے پر سُرخی بھی آگئی ہے، اتنے دن سے کہاں تھیں، میرے پاس کیوں نہیں آئیں؟"

"بس باجی! کام اتنا ہے کہ فرصت ہی نہیں ملتی۔"

"اس دن تم اتنی بیمار تھیں کہ میں سمجھی تمہارے چل چلاؤ کا وقت آ گیا ہے۔" ساجدہ زور سے ہنسی تو تاجی بھی کھسیانی سی ہنسی ہنس پڑی "تاجی! یہ تو بتا اس دن تمہارے کوارٹر میں خون کی بو کہاں سے آ رہی تھی؟ کیا خالہ بی نے تم پر سے کالی مرغی صدقے کی تھی؟"

"باجی! کالی مرغی صدقے کی جائے تو دام خرچ ہوتے ہیں، وہ تو میں خود صدقے ہوئی تھی، اسی کی بو ہو گی باجی!" وہ سگریٹ کے ٹکڑے کو مسلتی ہوئی اُٹھی اور جیسے آنسوؤں کو روکتی ہوئی چلی گئی۔

ساجدہ کو دیر تک افسوس ہوتا رہا کہ اس نے تاجی کو خواہ مخواہ رنجیدہ کر دیا۔

گرمیوں کی طویل دوپہروں میں وہ سلیمہ کے پاس بیٹھی باتیں کرتی رہتی۔ ان کی باتیں عام طور سے ماضی سے وابستہ ہوتیں۔ وُہ ماضی جو گزرا ہُوا کل تھا اور وُہ ماضی جس نے برسوں کا فاصلہ طے کر لیا تھا۔ مگر کتنی عجیب بات تھی کہ ساجدہ سلیمہ سے محبت کرنے کے باوجود اپنے ماضی کے اس حصّے کو کبھی نہ دُہرا سکی جو صلاح الدین تھا، وُہ ماضی جس کا وُہ اپنے حال میں انتظار کر رہی تھی۔ وہ ڈرتی تھی کہ کہیں اس کے ماضی کو کوئی کسی دلیل سے مٹا نہ دے، اس کے انتظار کو مشکوک نہ کر دے۔

وہ کبھی کبھی سلیمہ سے محبّت کے موضوع پر بات کرتی تو وہ ایک دم سنجیدہ ہو جاتی۔ وُہ اپنے اس خیال کو بدلنے کے لیے تیار نہ تھی کہ مرد اور عورت کی محبّت محض بھُوک کا دُوسرا نام ہے، اور یہ اتنی خود غرض بھُوک ہوتی ہے جو سارے رشتوں ناطوں کی محبتوں کو چاٹ جاتی ہے۔ کال پڑ جاتا ہے مگر اس محبت کا پیٹ پھر بھی نہیں بھرتا۔

ساجدہ کو پورا احساس تھا کہ سلیمہ کے خیالات اس کے ماضی کی پرچھائیں ہیں۔ وہ ماضی جو نہ جانے کیسے غلط طریقے سے اس کی زندگی پر چھا گیا۔ اسے سلیمہ پر رحم

آنا۔ کیا وہ ہمیشہ محبت سے محروم رہے گی!

اگر وہ سلیمہ کو سمجھانا چاہتی تو وہ اس طرح ہنستی جیسے ساجدہ اس کے سامنے محض ایک ایسی احمق لڑکی ہے جو کسی معاملے کی گہرائی تک جانے کی صلاحیت نہیں رکھتی۔ اور ہنسی کا یہ انداز ساجدہ کے لیے ناقابلِ برداشت ہوتا۔

رات وہ اماں بی کے کمرے میں بیٹھی باتیں کر رہی تھی کہ ناظم آگیا اور ساجدہ کو بیٹھے دیکھ کر ضرورت سے کچھ زیادہ ہی سنجیدہ ہو گیا۔

"آپ کیسی ہیں اماں بی؟" اس نے جیسے بڑے تکلف سے پوچھا۔

"کیا حال ہے تمھارے پاکستان کا، سب خیریت ہے نا؟" اماں بی نے بڑے سرسری انداز سے پوچھا۔

"میرا پاکستان!" —— وہ ہنس پڑا —— "کیا آپ کا پاکستان نہیں ہے؟ مگر آپ لوگ تو یہ سمجھتے ہیں کہ پاکستان صرف میرا ہے، میرا مقصد ہے کہ نام کی حد تک۔ باقی یہاں جو کچھ ہے وہ سب آپ لوگوں کا ہے۔"

"میرا نہیں، میرا کچھ بھی نہیں ہے، جو کچھ ہے وہ تمھارے باپ، بھائی اور تمھاری خالہ بی کا ہے۔ خیر، یہ بتاؤ، کبھی کبھار اماں کو پوچھنے کیسے آجاتے ہو؟" اماں بی کے لہجے میں بلا کا طنز تھا۔

"آپ ہر وقت میرے دل میں رہتی ہیں اماں بی!" وہ کچھ شرمندہ سا ہو گیا "بات یہ ہے اماں کہ آپ ہمیشہ ہمارے ابّا کے، میرا مطلب ہے کہ مالک کے تصور میں قید رہیں، کم از کم آپ نے یہ تو سوچا ہوتا کہ میں نے زندگی کے چند سال

آپ کی گود میں گزارے۔ کاظم کی طرح میں خالہ بی کی گود میں نہیں پلا۔ میں ہمیشہ آپ کی محبّت کا بھوکا رہا مگر آپ ——"

"کیا یہ سب کچھ تم ساجدہ کو سنا رہے ہو، میں نے اسے سب کچھ بتا دیا ہے۔ اب اور بتانے کو کیا رہ گیا ہے!"

ناظم نے امّاں کو دُکھی دُکھی نظروں سے دیکھا اور سر جھکائے کمرے سے نکل گیا۔

"امّاں بی! ایک بات پُوچھوں؟" ساجدہ نے آہستہ سے کہا۔

"پُوچھو، مگر دیکھو وہ بات میری زندگی سے متعلق نہ ہو۔ سجّو! تم نے کبھی بندر کا گھاؤ دیکھا ہے؟"

"جی، امّاں بی! وہ گھر جو میرا تھا، وہاں چھت پر ایک زخمی بندر آکر پڑ رہا تھا۔ اس کے بعد تو ایسا معلوم پڑتا تھا جیسے سارے شہر کے بندر میری چھت پر جمع ہو گئے ہیں۔ وہ آتے زخم کو نوچ کھسوٹ کر دیکھتے اور پھر چلے جاتے۔ زخم بڑھتا جاتا اور آخر ایک دن ——" وہ چپ ہو گئی۔

"اور میں زخمی بندر کی طرح نہیں مرنا چاہتی۔"

اس کے بعد دیر تک سنّاٹا چھایا رہا۔ امّاں بی نے سرہانے رکھا ہوا زنانہ رسالہ اٹھا کر بڑے انہماک سے پڑھنا شروع کر دیا اور ساجدہ شرمندہ سی بیٹھی اِدھر اُدھر دیکھتی رہی اور پھر دبے قدموں کمرے سے نکل کر گیلری میں آ گئی۔ وہ اس وقت سخت الجھن محسوس کر رہی تھی۔ وہ سوچ رہی تھی کہ کیا محبت اور نفرت کے درمیان کوئی اور جذبہ بھی ہوتا ہے، اور اگر ہوتا ہے تو اسے کون سا نام دیا جا سکتا ہے!

سلیمہ کے کمرے کے دروازے کے پاس سے گزرتے ہوئے وہ ٹھٹھک کر کھڑی ہوگئی۔ سلیمہ بڑے دردناک انداز سے بھرائی ہوئی آواز میں کہہ رہی تھی "تم ان سے دُور رہو، تم اپنا کوئی تعلق نہ ظاہر کرو۔ اگر تم پکڑے گئے تو میں سچ مُچ مر جاؤنگی ناظم میرے بھیا! میں اس گھر میں صرف تمھاری خاطر رہ رہی ہُوں۔ اب میں اپنے پیروں پہ کھڑے ہونے کے لائق ہوگئی ہُوں۔ میں یہاں سے جا سکتی ہوں۔"

"سلیمہ! تم تو میرا فخر ہو، تم روتی ہو تو مجھے عجیب سا لگتا ہے، سنو، ایک بار کنفیوشس اپنے شاگردوں کے ساتھ ایک ریاست چھوڑ کر دُوسری ریاست میں جا رہا تھا۔ راستے میں اسے ایک روتی ہوئی عورت ملی اس نے پُوچھا کہ وُہ کیوں رو رہی ہے؟ عورت نے بتایا کہ یہاں ایک شیر نے میرے خُسر اور میرے بچّوں کو کھا لیا ہے۔ کنفیوشس نے پُوچھا کہ پھر تم یہاں کیوں رہتی ہو؟ عورت نے کہا کہ صرف اس لیے کہ یہاں کوئی جابر حکومت نہیں ہے۔ کنفیوشس نے اپنے شاگردوں سے کہا: لکھو کہ ایک جابر حکومت شیر سے بھی زیادہ خونخوار ہوتی ہے۔

ذرا دیر کے لیے بالکل خاموشی چھائی رہی۔

"مگر ناظم میرے بھیا!" سلیمہ کی گھُٹی گھُٹی آواز آئی "مگر تم کیا کر سکتے ہو؟"

ساجدہ آگے بڑھ گئی۔ اپنے کمرے کی طرف جاتے ہوئے وہ سوچ رہی تھی جو دُوسروں کا حساب غلط کرا دیتے ہیں، کیا وہ لیڈر بن سکتے ہیں؟ کیا وہ کسی جابر حکومت سے ٹکر لے سکتے ہیں؟

اس وقت ابّا کی یاد اس طرح ٹوٹ کر آئی کہ وُہ دیر تک چُپ چاپ بیٹھی دل ہی دل میں ان کی موت پر ماتم کرتی رہی۔

سارا دن بادل گھرے رہے، بُوندا باندی ہوتی رہی۔ مگر رات جب وہ اپنے کمرے کے دروازے بند کر کے سونے کی کوشش کر رہی تھی تو جیسے بادلوں میں بڑے بڑے سوراخ ہو گئے، چھاجوں پانی برس رہا تھا۔ اس نے دیکھا کہ چھت کے ایک کونے سے پانی کی لکیر دیوار پر رینگ رہی ہے۔ اسے یاد آیا کہ ایک بار ایسے ہی زور شور سے بارش ہو رہی تھی۔ گلی میں گھٹنوں گھٹنوں پانی بھرا ہُوا تھا۔ بچّے اس پانی میں کھیلتے اور شور مچاتے پھر رہے تھے۔ اس کے نئے گھر کی چھت کے ایک کونے سے پانی کی ایک لکیر دیوار پر رینگی تھی اور پھر وُہ لکیر پرنالے کی طرح بہنے لگی تھی۔ وہ ڈر رہی تھی کہ ابّا کی ساری زندگی کی مشقت کے صلے میں بنے ہُوئے گھر کی چھت کہیں بیٹھ ہی نہ جائے۔ اس کا جی چاہ رہا تھا کہ وُہ چھت پر جا کر کسی طرح پانی بند کر دے۔ وُہ اوپر جانے کے لیے اُٹھی ہی تھی کہ پتلون کی مُوہریاں چڑھائے صلاح الدین آگیا تھا۔ پانی دیکھ کر وُہ بھاگتا ہُوا کمرے سے نکل گیا اور ذرا ہی دیر میں چھت کا سوراخ بند کر کے واپس آگیا مارے ممنونیت کے وہ اس سے کچھ بھی تو نہ کہہ سکی تھی۔ وُہ سر سے پاؤں تک پانی میں شرابور تھا اور چنبیلی کے پوٹے کی طرح نکھرا ہُوا لگ رہا تھا ——— "میں تو سمجھی تھی کہ آج کمرے میں طوفانِ نُوح آجائے گا، میں ڈُوب جاؤں گی۔" اس نے

کہا تھا تو وہ زور سے ہنس پڑا تھا "ہم نے کوئی گناہ نہیں کیا۔"

کسی نے ہولے سے دروازہ کھٹکھٹایا۔

"کون ہے؟" ساجدہ اٹھ گئی۔ "تاجی ہو گی۔" اس نے سوچا "ایسے زور سے بارش ہو رہی ہے، بیچاری اکیلی اپنے کوارٹر میں ڈر رہی ہو گی۔"

اس نے دروازہ کھول دیا، تو کاظم جیسے جھپٹ کر اندر آ گیا "میں نے سوچا تم ڈر رہی ہو گی۔" اس نے اندر سے دروازہ بند کر لیا۔

ساجدہ نے اسے غور سے دیکھا۔ اس کی آنکھوں سے بھوک ٹپک رہی تھی اور چہرہ پیاس سے مسخ ہو رہا تھا۔ اس نے محسوس کیا کہ وہ طوفان میں گھری ہوئی ہے۔

"کاظم! یہ تاجی کا کوارٹر نہیں، میرے کمرے سے نکل جاؤ، تم غلط جگہ پر آ گئے ہو۔" وہ غصے سے کانپ رہی تھی۔

"تاجی تم سے بہت اچھی ہے، وہ ہمارا نمک کھاتی ہے تو حقِ نمک بھی ادا کرتی ہے، اور تم ہمارے ٹکڑوں پر پل رہی ہو اور ہمیں کو کمرے سے نکلنے کا حکم دیتی ہو۔ تم کچھ بھی نہیں ہو، تمھارا اور کوئی مصرف نہیں ہے، سمجھ گئیں منشی کی اولاد؟" وہ طنز سے ہنسا۔

ساجدہ کو ایسا محسوس ہوا جیسے وہ پاگل ہو گئی ہے۔ اس نے جھپٹ کر کاظم کا گریبان پکڑ لیا اور اتنی زور سے دھکا دیا کہ اس کا سر زور سے دیوار سے ٹکرا گیا۔

"اور یہ ہے تیرا مصرف!" ساجدہ زور سے چیخی اور اس سے پہلے کہ کاظم سنبھلتا وہ دروازہ کھول کر اندھیری گیلری میں سلیمہ کے کمرے کی طرف بھاگ رہی تھی

ایک دم کسی نے اس کے کندھوں پر نرمی سے ہاتھ رکھ دیا۔

"میرے کمرے میں چلو ساجدہ بی بی! کسی سے کچھ نہ کہو، اگر تم نے کچھ کہا سنا

تو ــــــــ" ناظم اسے سہارا دیے اپنے کمرے میں لے آیا۔ صدمے اور غصّے سے وہ نیم بیہوش سی ہو رہی تھی، ناظم نے اسے آہستہ سے کرسی پر بٹھا دیا اور مجرموں کی طرح سر جھکا کر دوسری کرسی پر بیٹھ گیا۔

چند ہی لمحوں میں وہ سوچنے سمجھنے کے لائق ہو گئی۔ اس نے ناظم کو نفرت سے دیکھا اور پھر دونوں ہاتھوں میں منہ چھپا کر سسکیاں بھرنے لگی۔ "تم، تم ــــــ تم مجھے کیمپ سے کیوں لاتے تھے؟"

"میں خود کو مجرم سمجھ رہا ہوں، میں تمھاری حفاظت نہ کر سکا۔ خالہ بی نے اس کے ایک جرم پر پردہ ڈال کر دوسرا جرم کرنے کی اجازت دے دی۔ اور اب تو وہ مقابلے کے امتحان میں پاس ہو گیا ہے۔ اس نے گھر سے حکومت کرنے کی مشق شروع کر دی ہے۔ مگر اب وہ تمھارا کچھ نہ بگاڑ سکے گا، مت رو ساجدہ بی بی!" ناظم کے لہجے میں ندامت چیخ رہی تھی۔

"میں اپنی حفاظت کرنا جانتی ہوں، میں صبح سب کو بتاؤں گی کہ اس گھر میں کتنا بڑا شیطان پل رہا ہے اور پھر میں اس گھر پر تھوک کر چلی جاؤں گی، مجھے آپ کی ہمدردی کی ضرورت نہیں۔ میں آپ کی حفاظت کی محتاج نہیں۔ مجھے آپ سے نفرت ہے، سمجھ گئے آپ؟ مجھے آپ سے نفرت ہے۔ آپ نے میرے ابا کا حساب عمر کے آخری حصّے میں غلط کر دیا۔"

"میں نے نہیں ساجدہ بی بی! حساب تو انھوں نے غلط کیا جو پاکستان کو بنانے نہیں لوٹنے لگے تھے۔ میں تو اشاروں میں انھیں سمجھا رہا تھا، تم مجھ سے جتنی بھی نفرت کرو، میں تم سے محبت کرتا ہوں۔ تم کہیں نہیں جاؤ گی۔"

ناظم کی آنکھوں میں دو شفاف آنسو چمکے اور ضبط کے دامن میں چُھپ گئے۔

ساجدہ نے اسے حیرت سے دیکھا اور پھر نظریں جُھکا لیں۔

"آپ وقت سے فائدہ اٹھا رہے ہیں۔" وہ پھُوٹ پھُوٹ کر رونے لگی۔

"نہیں، ساجدہ بی بی! میں تم کو اپنی زندگی کا ساتھی بنانا چاہتا ہُوں۔ میں تمھاری نفرت کو محبت میں بدل دُوں گا اور ——" ناظم بات پُوری بھی نہ کر پایا تھا کہ ساجدہ ایک دم کُرسی سے اُٹھ کر دروازے کی طرف بڑھی اور پھر جیسے جھجک کر واپس آ گئی۔ "کیا آپ یہ چاہتے ہیں کہ میں یہاں نہ بیٹھوں، میں آج اپنے کمرے میں نہیں جا سکتی مجھے وہاں کی ہر چیز سے خوف آ رہا ہے۔" وہ اپنے جذبات چھپا نہ سکی۔ اس وقت وُہ خود کو بیحد تنہا اور بے بس محسوس کر رہی تھی۔

"تم یہاں آرام سے سو جاؤ۔ اندر سے دروازہ بند کر لو۔" ناظم تیزی سے کمرے سے باہر چلا گیا۔

رات اس نے کرسی پر بیٹھ کر گزار دی۔ خوف و دہشت سے لدی پھندی، برستی ہُوئی یہ رات اس پر سے قیامت کی طرح گزر رہی تھی اسے ایسا محسوس ہو رہا تھا وہ کسی بال سے زیادہ باریک اور تلوار کی دھار سے زیادہ تیز چیز پر سے گُزر رہی ہے۔ ذرا بھی اِدھر اُدھر ہوئی تو کٹ کر گر جائے گی۔ اس نے ایک لمحے کو سوچا' دنیا میں اتنے بہت سے پُل صراط کہاں سے آ گئے، وہ ان پر کب تک چل سکے گی، کب تک ——!

بھیگی ہوئی صبح کی روشنی جب کھڑکی کے شیشوں پر پڑی تو اس نے محسوس کیا کہ اب وُہ اٹھ سکتی ہے۔ اب وہ سوچ سکتی ہے، اور اسی لمحے اسے خیال آیا کہ

وہ کہیں نہ کہیں ڈھونڈنے والا کہاں کھو گیا!

ساری رات کی جگائی اور ذہنی اذیّت نے اس کے جسم وجاں کو کھنڈر کر دیا تھا۔ وُہ کسی نہ کسی طرح خود کو سنبھالتی کمرے سے باہر نکلی۔ باورچی خانے سے برتنوں کے رکھنے اٹھانے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ ابھی شاید سب سو رہے تھے کیونکہ کمروں کے سب دروازے بند تھے۔ صرف کھانے کے کمرے کا دروازہ کھُلا تھا۔ اس نے جھانک کر دیکھا ناظم کرسی کی پشت سے سر ٹکائے سو رہا تھا، اسے یوُں ہی سا افسوس ہُوا کہ اس کی وجہ سے ناظم نے رات بے چینی سے گزاری۔

وُہ اپنے کمرے میں جانا چاہتی تھی مگر اس خیال سے وہ کانپ گئی کہ وہاں کاظم نہ بیٹھا ہو۔ وہ خاموشی سے سلیمہ کے دروازے سے ٹیک لگا کر کھڑی ہو گئی۔

اب دُوسرے کمروں سے کھانسنے، کھنکھارنے کی آوازیں آ رہی تھیں۔

سلیمہ کے کمرے کا دروازہ کھُلا تو ساجدہ کھڑے قد سے گرتے گرتے بچی۔ سلیمہ نے اسے حیران ہو کر دیکھا اور پھر سہارا دے کر اندر لے گئی "تم یہاں کیوں کھڑی تھیں سجّو؟ یہ تمھارا کیا حال ہو رہا ہے؟ مجھے بتاؤ؟" سلیمہ نے اسے اپنے بستر پر بٹھایا تو وہ پاؤں پھیلا کر لیٹ گئی۔ اس کی آنکھیں جیسے خود بخود مُند گئیں اور اسی عالم میں اس نے رات کی ساری بھیانک کہانی سُنا ڈالی۔ اور جب آنکھیں کھول کر سلیمہ کی طرف دیکھا تو اس کے چہرے پر پسینے کے موٹے موٹے قطرے اُبھرے ہُوئے تھے اور اس کی آنکھیں اسی طرح جھکی ہُوئی تھیں جیسے اب وُہ کبھی ساجدہ کی طرف نظر اٹھا کر نہ دیکھ سکے گی۔

"باجی! اگر آپ یوُں نظریں جُھکا لیں گی تو پھر میں کس کو دیکھوں گی"۔ ساجدہ نے

بیٹھتے ہوئے سلیمہ کا ہاتھ تھام لیا۔ "اور باجی! ناظم مجھ سے شادی کرنا چاہتے ہیں۔"

"اوہ!" سلیمہ جیسے سب کچھ بھول گئی "سچ ساجدہ؟ مجھے معلوم ہے وُہ کتنا اچھا انسان ہے! وہ میرا بھیّا ہے۔ مجھے بہت دن سے معلوم ہے کہ وہ تم سے محبت کرتا ہے۔"

"ناشتہ تیار ہے، سب لوگ میز پر آجائیں۔" روزانہ کی طرح آج بھی تاجی کی آواز گیلری میں گونج رہی تھی۔

"تم مان جاؤ ساجدہ! ——— میں ——— میں ———" جانے وُہ کیا کہنا چاہتی تھی مگر کہہ نہ سکی۔

ساجدہ نے بے بسی سے اس کی طرف دیکھا۔ سلیمہ کی نظروں میں اتنی التجا تھی کہ وُہ حیران رہ گئی۔

امّاں بی کے سوا ناشتے کے لیے سب موجود تھے۔ آج کاظم خالہ بی اور مالک کے درمیان والی کرسی پر بیٹھا ہوا تھا۔ تینوں بجد خوش نظر آرہے تھے۔ رات کی بارش نے جیسے ان کے چہروں کو نکھار دیا تھا۔ تاجی بڑی تیزی سے گرم گرم پراٹھے اور آملیٹ لے کر آرہی تھی۔

"یہ آج تم تینوں اتنے چپ چپ کیوں نظر آرہے ہو؟ پتا ہے اب میرے بیٹے کو ملازمت ملنے والی ہے، سرکاری خط آگیا ہے، وہ بڑا افسر بنے گا، میں تو رات مارے خوشی کے سو بھی نہ سکی۔" خالہ بی کی آنکھوں میں مسرت کے آنسو آگئے۔

"آپ نے مجھے کب قہقہے لگاتے دیکھا ہے امّی؟" سلیمہ نے جل کر کہا اور

گھور کر کاظم کو دیکھا "ہنسنا ہر انسان کا پیدائشی حق ہوتا ہے مگر مجھ سے میرا یہ حق بھی چھین لیا گیا ہے۔" وہ برابر کاظم کو گھورے جا رہی تھی۔

"بھائی میاں اور سلیمہ باجی کو بھلا کیا مسرت ہو سکتی ہے خالہ بی! آج تو انھیں دُنیا بھر کے دُکھ یاد آئیں گے۔

ناظم نے نفرت سے کاظم کی طرف دیکھا "ٹھیک ہے، مگر تم جس بات پر خوش ہو رہے ہو میں اسے ماتم سمجھتا ہوں، میں تمھارے مستقبل سے واقف ہوں۔"

"بھائی میاں! اگر آپ کچھ نہیں بن سکے تو اس میں میرا کیا قصور ہے۔" اس نے زور سے قہقہہ لگایا۔

ناظم نے جیسے اس کے قہقہے کو سُنا ہی نہیں۔ وہ بڑے سکون سے ناشتہ کرنے لگا۔)

ساجدہ نے ایک لمحے کو نظر اٹھا کر کاظم کی طرف دیکھا اور گھبرا کر نظریں نیچی کر لیں۔ وہ اسی کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اس کی نظروں میں انتقام کی آگ سلگ رہی تھی۔ مالک شاید ابھی پُوری طرح ہوش میں نہیں آئے تھے یا پھر ابھی سوچنے سمجھنے کی صلاحیت پیدا نہیں ہُوئی تھی۔ رات کی پی ہُوئی مے اب تک جیسے آنکھوں سے ٹپک رہی تھی۔ وہ یوں ہی گردن ہلا ہلا کر سب کی طرف دیکھ رہے تھے۔

"آج تو مٹھائی کھانے کا دن ہے ——" تاجی نے چائے کی کیتلی میز پر رکھتے ہوئے کہا "آپ لوگ کہیں تو کڑاہی چڑھاؤں، گلگلے تلوں۔ کاظم میاں افسر بن جائیں گے، ہائے میں تو خوشی سے مری جاتی ہوں۔" اس نے سلیمہ اور ساجدہ کو چڑانے والی نظروں سے دیکھا۔

"اوہ! اگریٹ تاجی! تم ضرور کڑاہی چڑھاؤ۔ تمھارے ساتھ ساجدہ بھی گلگلے تلیں گی۔"
کاظم نے پھر قہقہہ لگایا۔

"بکواس بند کرو۔" سلیمہ ایک دم دھاڑی "تاجی! تم کمرے سے نکل جاؤ۔ اب کسی چیز کی ضرورت نہیں۔"

"واہ سلیمہ باجی! گلگلے تلنے کو کسی نے کہا اور کھولتا ہوا تیل آپ پر گر گیا۔" تاجی آج پہلی بار اس طرح جواب دے رہی تھی۔

"پاؤں کی جوتی سر پہ آتی ہے۔" خالہ بی غصّے سے سُرخ پڑ گئیں۔ "نکل یہاں سے گُتیا، بہت سر چڑھ گئی ہے۔"

"بس بس خالہ بی! غصّہ تھوک دیں۔ اسے آپ ضرور نکالئے گا، مگر ذرا شان سے۔ میں اس کے لیے ایک بابُو قسم کا آدمی تلاش کر لوں۔" کاظم نے ہنستے ہوئے تاجی کو دیکھا۔

"فی الحال تو تم سے بڑا بابُو کون ہو گا!" ناظم نے ہنستے ہوئے کہا۔ مگر کاظم نے جیسے کچھ سُنا ہی نہیں۔ ہاں خالہ بی نے چونک کر ناظم کی طرف دیکھا۔ تاجی روتی ہوئی کمرے سے چلی گئی، تو خالہ بی نے سر تھام لیا۔

"میرے اللہ! یہ سب کیا ہے، اس گھر کی پہلے تو یہ حالت نہ تھی۔" خالہ بی کی آواز بھرا گئی۔ جب سے تم لوگوں نے ہوش سنبھالا ہے اس وقت سے اپنی اپنی مرضی کے مالک ہو گئے ہو، کوئی میری بات نہیں سنتا۔ میں نے اس گھر کے لیے خود کو مٹا دیا۔ سب کی خوشیوں کے لیے سارے دُکھ سمیٹ لیے، مگر کوئی خوش نہیں، کوئی میرے لیے نہیں سوچتا۔" وہ رونے لگیں "میں اب تھک گئی ہُوں۔

میں اب مرنے والی ہوں۔" اُنھوں نے دونوں ہاتھوں سے مُنہ چھپا لیا۔

"تم —— تم رو رہی ہو؟" مالک نے نوالہ پلیٹ میں رکھ دیا۔ ساجدہ نے حیرت سے دیکھا کہ ان کی آنکھوں سے آنسوؤں کے قطرے میز پر ٹپک رہے ہیں۔ وہ تیزی سے اُٹھ کر اپنے کمرے میں چلے گئے۔

ایک لمحے کو سناٹا چھا گیا۔ سلیمہ اپنی روتی ہُوئی ماں کو بڑی عجیب نظروں سے دیکھ رہی تھی۔ نفرت، محبّت، بے بسی، پاگل پن، بغاوت، کیا کچھ تھا ان نظروں میں۔ ساجدہ حیران ہو کر اسے دیکھ رہی تھی۔

"خالہ بی پھر سے بچپن کی طرف لوٹ رہی ہیں۔" کاظم نے اپنے حسابِ مزاح کے خزانے کا منہ کھول دیا اور ثبوت کے طور پر ایک زوردار قہقہہ لگایا۔

"ظالم!" سلیمہ زور سے چیخی تو کاظم ایک دم سنجیدہ ہو گیا۔

"سب مزے سے بیٹھے دیکھ رہے ہیں کہ خالہ بی کتنا رو سکتی ہیں، اور ظالم مجھے کہا جا رہا ہے۔ یہ تمھاری ماں نہیں ہیں سلیمہ! اصل میں تو میری ماں ہیں۔" اس نے چڑانے والی نظروں سے سلیمہ کو دیکھا اور بڑے سکون سے جیسے ٹہلتا ہوا کمرے سے چلا گیا۔

ساجدہ نے اُٹھ کر خالہ بی کے گلے میں باہیں ڈال دیں اور پھر جانے اس کے اندر کون سا جذبہ پھڑکا کہ وُہ ان سے لپٹ کر خود بھی رونے لگی۔

اور جب خالہ بی اسے تھپک تھپک کر چپ کرا رہی تھیں تو اس نے دیکھا کہ کمرے میں اب کوئی بھی نہیں تھا۔

آج صبح سے گھر میں سخت دُھوم دھام مچی ہوئی تھی۔ تاجی اور خالہ بی کاظم کا سامان باندھ رہے تھے۔ کاظم کی تربیت مکمل ہو گئی تھی۔ اب لاہور سے چالیس میل دُور سب ڈویژنل مجسٹریٹ کے عُہدے پر تقرری کے آرڈر آ گئے تھے آج وُہ چارج لینے جا رہا تھا۔ مالک اور خالہ بی جیسے خوشی سے پُھولے نہیں سما رہے تھے۔

کھانا کھاتے ہوئے ناظم نے اس کی طرف غور سے دیکھا۔ کاظم بیحد مغرور نظر آ رہا تھا۔

"میں تو تم کو مبارکباد کہنا بھی بھُول گیا، مبارک ہو کاظم!" ناظم نے اس طرح کہا جیسے وہ شعوری طور پر خود کو بڑا ثابت کرنے کی کوشش کر رہا ہو۔

"میرے یہاں سے جانے کی مبارکباد کہہ رہے ہیں؟"

"دونوں باتوں کی۔" سلیمہ نے ہنستے ہوئے کاظم کی بات پُوری نہ ہونے دی۔

"چالیس میل کا فاصلہ کیا حیثیت رکھتا ہے۔ رات آرام سے آپ سب کے ساتھ گزارا کروں گا۔" کاظم نے اسی طرح کہا جیسے کسی اہم خبر کا اعلان کر رہا ہو۔

ساجدہ نے بڑی بے چینی سے سلیمہ کی طرف دیکھا۔ آج دو دن بعد اس نے سکون کی سانس لی تھی۔ کاظم کے جانے کے خیال سے اس نے آزادی کی فضا

محسوس کی تھی۔ جب سے کاظم نے اسے ستایا تھا وہ سلیمہ کا سایہ بن گئی تھی۔

"میری بہن کو بتا آتے ہو کہ آج تم چارج لینے جا رہے ہو۔" خالہ بی نے بڑی محبّت سے پُوچھا۔

"صبح پہلا کام یہی کیا تھا۔ امّاں بی نے دُعا بھی دی تھی۔" کاظم نے کہا۔

"کیا؟" مالک نے ہنستے ہوئے پُوچھا۔

"اللہ تم کو توفیق دے کہ تمھاری وجہ سے کبھی کسی کا دل نہ دُکھے۔" کاظم نے ہنستے ہوئے بتایا۔

"ٹھیک کہا ہے انھوں نے ——" تاجی نے گرم گرم روٹیاں پلیٹ میں رکھتے ہوئے کہا "جس دل میں خدا بستا ہو اسے نہ دکھانا چاہیے۔ آپ لوگوں کو پنجابی زبان نہیں آتی، اگر پنجابی زبان میں ——"

کاظم، مالک اور خالہ بی تاجی کو دیکھ کر ہنسنے لگے تو وہ گھبرا کر چلی گئی اور ساجدہ سوچ رہی تھی کہ وہ کون سا دل ہے جس میں خدا نہیں بستا، اور خدا کی اس بستی کو کس کس طرح اُجاڑا جاتا ہے، کس کس طرح دکھایا جاتا ہے، آخر یہ انسان دلوں کے پھوڑے لے کر خدا کے پاس کس منہ سے جائے گا!

اس دن کے واقعے کے بعد ساجدہ راتیں سلیمہ کے کمرے میں گزارتی۔ کاظم گھر میں ہوتا تو وہ مارے ڈر کے سلیمہ کے ساتھ رہتی۔ اس وقت بھی وہ سلیمہ کے کمرے میں تنہا بیٹھی سوچ رہی تھی کہ وُہ کیا کرے۔ یہاں سے چلی بھی جائے تو پھر؟ —— اسے ناظم کے وہ الفاظ یاد آ گئے جو اس نے بڑی شان سے کہے تھے یہاں افسر بہادر کی حکومت ہے تمھاری فریاد کون سُنے گا! تاجی کے کوارٹر کی کچے کچے خُون کی بُو اس کا دماغ چیرنے لگی۔ اس کا جی چاہا کہ وہ زور زور سے چیخے۔ مارے خوف کے اس نے اپنا چہرہ دونوں ہاتھوں سے چھپا لیا۔

ناظم کمرے میں آیا تو اس نے خود کو بڑی مشکل سے سنبھالا "بیٹھیے۔" اس نے گھُٹی گھُٹی آواز میں کہا۔

"ساجدہ بی بی! کیا سوچا تم نے؟ کیا ہم ایک ساتھ زندگی نہیں گزار سکتے؟" ناظم نے آہستہ سے سوال کیا۔

"اب تو سب کچھ ہو سکتا ہے ناظم صاحب!" وہ جیسے کنویں سے بولی "میں آپ کو صرف ایک بات بتانا چاہتی ہوں، میں کسی سے محبت کرتی ہوں، کتنے برس گزر گئے یاد نہیں۔ میں رات دن اس کا انتظار کر رہی ہوں۔" اس نے اس طرح

لمبی سانس لی جیسے اپنی سانس کو ڈوبنے سے بچا رہی ہو۔

"ان باتوں سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ شکر ہے تم محبت کرتی ہو نفرت نہیں۔" ناظم نے بغیر کسی حیرت کے بڑے سکون سے کہا۔

"میں اب بھی اس سے محبت کرتی ہوں۔ شاید میں اس سے ہمیشہ محبت کرتی رہوں گی۔ میں اس کا انتظار کر رہی ہوں۔ آپ اس انتظار کو ختم کر دیجئے۔ مجھ سے اب یہ کرب برداشت نہیں ہوتا۔ آپ میری باتیں سمجھ رہے ہیں نا؟" اس کا لہجہ جیسے کھنایا ہوا لگ رہا تھا۔

"تمہارا انتظار میں کس طرح ختم کر سکتا ہوں ساجدہ بی بی؟" ناظم بیوقوفوں کی طرح اس کا منہ تک رہا تھا۔

"سارے اخباروں میں اشتہار دے دیجئے کہ ساجدہ بنت محمد رمضان مرحوم، دلی کے مہاجر کی بیٹی صلاح الدین ولد علاءُ الدین کا انتظار کر رہی ہے۔ وہ جہاں بھی ہوں اس پتے پر آکر ملیں۔" وہ کھوئی کھوئی نظروں سے ناظم کو دیکھ رہی تھی۔

"میں آج ہی یہ اشتہار دے دُوں گا۔ خدا کرے وہ زندہ سلامت ہوں۔ وہ جلد تم سے آکر ملیں، اور کچھ؟" ناظم نے پُوچھا۔

"وہ نہیں کہیں ہوں گے۔" وہ جیسے بڑبڑائی۔ "وہ اصل میں تو پنجابی تھے، مجھے یاد نہیں پڑتا کہ وہ کہاں رہتے تھے۔ وہ تو دلّی میں پڑھنے کے لیے آئے تھے وہ۔" وہ جیسے چونک پڑی۔ "ناظم صاحب! پتا ٹھیک لکھئے گا۔" اس کی آنکھوں سے شک جھانک رہا تھا۔

"کل تم خود پڑھ لوگی۔" وہ جانے کے لیے کھڑا ہو گیا۔

"میں آٹھ دن انتظار کروں گی اور بس"۔ پھر آپ جو چاہیں گے ــــــــ"

اس کی آواز بھرا گئی۔

گیلری میں ایک لمحے کو رُک کر ناظم نے اپنی آنکھوں سے آنسو پُوچھے، اسے تو پتا بھی نہ چلا تھا کہ ان آنسوؤں کو کس جذبے نے جنم دیا تھا۔

خبریں اتنی گرما گرم تھیں کہ اشتہار دیکھنے کون بیٹھتا۔ ساجدہ نے اشتہار دیکھ کر اخبار لپیٹ دیا۔ اشتہار کے سلسلے میں اس نے سلیمہ کو کچھ بھی نہ بتایا تھا۔ جانے کیوں وہ یہ بات اس سے نہ کہہ سکی۔

اشتہار چھپنے کے دُوسرے دن سے ہی اس کی آنکھیں گیلری کے دروازے پر ٹک گئیں۔ ذرا سا دروازہ کھٹکتا تو وُہ چونک پڑتی "کون؟" اس کے ہونٹ آہستہ سے لرزتے۔ جانے کون کون آتا رہا جاتا رہا اور انتظار کا کرب اس کی آنکھوں میں چُبھتا رہا۔

امید و بیم نے اسے اتنا نڈھال کر دیا تھا کہ وُہ برسوں کی بیمار لگنے لگی تھی۔ ان دنوں وہ سب کے ساتھ کھانا کھانے بھی نہ گئی۔ سلیمہ اسے اپنے کمرے ہی میں زبردستی چند نوالے کھلا دیتی۔ اور یہ سوچ سوچ کر کُڑھتی کہ کاظم نے اسے اس حالت تک پہنچایا ہے۔

خالہ بی، اماں بی اور مالک اسے کئی مرتبہ دیکھنے آئے۔ سب کا خیال تھا کہ اس پر یرقان کا حملہ ہوا ہے صرف تاجی اسے عجیب عجیب نظروں سے دیکھتی لیکن سلیمہ کے ڈر سے کچھ کہہ نہ پاتی۔

آج دوپہر تاجی اس کے لیے کھانا لے کر آئی تو سلیمہ غُسل خانے میں تھی۔

"ساجدہ باجی! کیا پیٹ میں درد ہوتا ہے؟" تاجی نے اس کے پیٹ پر ہاتھ رکھ کر جانے کیا ٹٹولا، اور پھر جیسے مایوس ہو کر دونوں ہاتھ ملنے لگی۔

"اب تم کو اطمینان ہو گیا تاجی ؟ تم اس سے زیادہ اور کیا سوچ سکتی ہو۔"

"باجی ! پیٹ میں درد ہو تو اسی طرح کمزوری ہو جاتی ہے۔" تاجی نے بڑی ڈھٹائی سے اس کی بات ٹال دی "ایک بار میں نے کچھ کچے چنے کھا لیے تھے تو اسی طرح پیٹ میں درد رہنے لگا تھا، پھر امّاں نے پیٹ کی مالش کی تو دو تین دن میں ٹھیک ہو گئی تھی۔ پر آپ کو تو جانے کون سا روگ لگ گیا ہے !"

"ہُوں !" ساجدہ نے آنکھیں بند کر لیں تو تاجی دبے پاؤں چلی گئی۔

چھ دن گزر گئے۔ ساجدہ آنکھیں بند کیے سوچتی رہتی، وہ میرا ڈھونڈنے والا کہاں کھو گیا ؟ —— کہاں ؟

سلیمہ حتی الامکان ساجدہ کے پاس ہی رہتی۔ کاظم کو بُرا بھلا کہتی رہتی اور اسے سمجھاتی رہتی کہ ناظم سے شادی کر کے کاظم کا مُنہ کالا کر دے، اسے بتا دے کہ وہ اس گھر کی عزت ہے۔ ساجدہ سب کچھ سنتی اور اسے بے بسی سے دیکھتی رہتی۔

آخر انتظار کے آٹھ دن صدیوں کی طرح گزر گئے۔ اور اسے جیسے قرار آ گیا جیسے قبرستان سے واپس آتے ہی قرار آ جاتا ہے۔ نویں دن وہ بستر سے اُٹھی تو اس کے پاؤں لڑکھڑا رہے تھے۔ پھر بھی وہ سلیمہ کے ساتھ ناشتہ کرنے چلی گئی۔

چائے پیتے ہُوئے اس نے ایک بار ناظم کی طرف دیکھا اور نظریں جھکا لیں۔ اس نے اپنے دل کو ٹٹولا، کیا وہ قربانی دینے کے لیے تیار ہے ! کیا اب اس دُنیا میں کبھی کوئی معجزہ نہ ہو گا ؟ اس نے اپنے آپ سے پُوچھا۔

اسے کون سمجھاتا کہ حقیقت کتنی سفاک ہو چکی ہے۔

اس کے ہاتھ کانپنے لگے تو اس نے پیالی میز پر رکھ دی اور سب کے سوالوں

کو روندتی ہوئی سلیمہ کے کمرے میں جا کر یُوں بستر پر پڑ گئی جیسے اب کبھی نہ اُٹھے گی۔

"تم ٹھیک تو ہو ساجدہ؟" سلیمہ اس کے پیچھے پیچھے چلتی آئی تھی۔

"میں بالکل ٹھیک ہُوں باجی!" ساجدہ ہنس پڑی۔ "آپ جا کر ناشتہ کیجئے۔ میرا جی متلا رہا تھا۔"

"اوہ! میں سمجھی پتا نہیں کیا بات ہے!"

سلیمہ کے جاتے ہی ناظم یُوں کمرے میں آ گیا جیسے کہیں آس پاس کھڑا تھا۔ ساجدہ نے ایک لمحے کو اس کی طرف دیکھا اور پھر نظریں جُھکا لیں۔

"آپ!" وہ چُپ ہو گئی۔

"کہو ساجدہ بی بی۔" وہ بڑے سکون سے کُرسی کھینچ کر بیٹھ گیا۔

"آپ سب کچھ بُھول جائیں گے، آپ کبھی صلاح الدین کا نام نہیں لیں گے اور ——" اس کی آواز بھرا گئی۔

"میں صرف یہ جانتا ہُوں کہ مجھے تم سے محبّت ہے اور بس۔ مجھ پر بھروسا کرو۔"

"کس سے محبّت ہے؟" سلیمہ ساری کے پلّو سے ہاتھ پونچھتی اندر آئی اور دونوں کو اُلوؤں کی طرح دیکھنے لگی۔

"سلیمہ! میں ساجدہ بی بی سے شادی کرنا چاہتا ہُوں۔ تمھاری بھی خواہش تھی نا؟" ناظم نے پیار سے سلیمہ کی طرف دیکھا۔

"اوہ، بھیّا! تم نے تو یہ بات ایسی آسانی سے کہہ دی جیسے کوئی کہے میں کھیر کھانا چاہتا ہُوں۔ یہ بھی سوچا کہ اس گھر میں کتنا بڑا طوفان اُٹھے گا!"

کمرے میں ایک لمحے کو سنّاٹا چھا گیا اور ساجدہ نے سوچا، طوفان تو ضرور

اُٹھے گا۔ گھر میں اس کی حیثیت بس اتنی ہی تو ہے جتنی تاجی کی، فرق صرف اتنا ہے کہ وہ کیمپ سے آئی ہُوئی پڑھی لکھی تاجی ہے اور بس۔

"میں ایسے طوفانوں کی حقیقت جانتا ہوں، سلیمہ! تم فکر نہ کرو۔ مجھے صرف امّاں بی سے اجازت لینی ہے۔" وہ کُرسی سے کھڑا ہوگیا۔ "میں ابھی آتا ہُوں"۔

"سلیمہ باجی!" ساجدہ سر سے پاؤں تک کانپ رہی تھی۔

"کیا ہے میری جان؟" سلیمہ نے اسے لپٹا لیا۔

"امّاں بی ——" ساجدہ کچھ نہ کہہ سکی۔

"تم میرے ساتھ امّاں بی کے پاس چلو، تم دیکھو گی کہ وہ سب کی طرح نہیں ہیں"۔ سلیمہ نے ساجدہ کا ہاتھ مضبوطی سے پکڑ لیا۔

جب وہ امّاں بی کے کمرے میں جا رہی تھیں تو خالہ بی جھاڑن پکڑے خاک دُھول جھاڑتی پھر رہی تھیں۔ کتنی تھکی تھکی لگ رہی تھیں۔ صبح تڑکے اُٹھ کر کاظم کا ناشتہ خود تیار کرائیں، دوپہر کا کھانا ساتھ کرئیں اور پھر اسے رخصت کرکے سکون کی سانس لیتیں۔

جب وہ دونوں امّاں بی کے کمرے میں داخل ہُوئیں تو وہ ناظم کا ماتھا چُوم رہی تھیں۔ "ناظم میرے بیٹے! یہ تمھاری پہلی اور آخری خواہش ہے نا؟"

"ہاں امّاں بی! آپ یقین کریں۔"

امّاں بی نے کانپتی ہوئی ساجدہ کا سر اپنے سینے سے لگا لیا تو وہ جیسے ان کی گود میں گر پڑی۔

"جلدی سے چلو، امّی کاظم کو رخصت کر کے اپنے کمرے میں رنجیدہ پڑی ہیں کیونکہ وُہ کہہ گیا ہے کہ شاید آج رات وہ نہ آسکے۔ تاجی سب کا کھانا تیار کرنے میں جُتی ہُوئی ہے"۔ سلیمہ ایک ہاتھ میں اٹیچی پکڑے دُوسرے ہاتھ سے ساجدہ کو اُٹھا رہی تھی اور ناظم دُور کھڑا ساجدہ کے سفید ہوتے ہُوئے چہرے کو دیکھ رہا تھا۔

"خدا کے لیے اُٹھ جاؤ سجّو، میری جان! اگر کسی نے ہمیں گھر سے نکلتے دیکھ لیا تو سوالوں کی بوچھار ہوجائے گی"۔

ساجدہ یُوں بوکھلا کر اٹھی جیسے سچ مچ سوالوں کی بوچھار اس پہ آپڑی ہو۔ اس نے اپنا ٹھنڈا ہاتھ سلیمہ کی طرف بڑھا دیا اور پھر تینوں باہر نکل کر پُرانی سی کار میں بیٹھ گئے جو پھاٹک سے ذرا دُور سڑک کے کنارے کھڑی تھی۔

پُرانی سی کوٹھی کے ایک پورشن میں ناظم کے دوستوں نے ان کا خیر مقدم کیا۔

سجی ہُوئی مسہری پہ بیٹھے بیٹھے ساجدہ نے دیکھا کہ گھر میں شادی کا سماں تھا۔ ریشمیں کپڑے پہنے ہوئے ہنستی مسکراتی عورتیں لال پیلے کاغذ کی جھنڈیاں، فرش پر پڑی ہوئی ڈھولک، باہر سے آتی ہوئی قہقہوں کی آوازیں۔

ذرا دیر بعد وُہ سب ڈھول کے پاس بیٹھ گئیں، اور گانے شروع ہو گئے۔

شادی کے وُہ گانے جس میں باپ کی اونچی حویلی ہوتی ہے، وہ لکھ پتی ہوتا ہے۔

اور ساجدہ سر جھکائے بیٹھی سوچ رہی تھی، ابّا نے تو صرف دو کمروں کا گھر بنوایا تھا، جس کے صحن میں چنبیلی کا پودا لگا ہوا تھا۔

اور جب شادی کے گانے ختم ہو گئے تو سب فلمی گانوں پر دھاوا بولنے لگیں۔

رم جھم برسیں بادروا، مست ہوائیں آئیں

پیا گھر آجا آجا ، پیا گھر آجا!

اور ساجدہ سوچے جا رہی تھی۔ امّاں کہتی تھیں اگر مسافر رات کو سفر شروع کرے تو راستہ بھول جاتا ہے۔

پھر ایک دم شور مچا: جسے ہٹنا ہو ہٹ جائے قاضی جی اندر آتے ہیں۔

عورتوں نے بس یُوں ہی دوپٹوں کی آڑ کر لی۔ سلیمہ نے ساجدہ کو چادر اُڑھا دی، اور جب گواہوں کے سامنے اس سے پُوچھا گیا کہ اسے نکاح قبول ہے؛ تو اس نے فوراً "ہاں" کر دی، ایک بے اثر سی ہاں جس میں کوئی جذبہ شامل نہ تھا۔ وہ تو لڑکیوں کی طرح رو بھی نہ سکی۔

ذرا ہی دیر میں سلیمہ اور سلیمہ کی سہیلی خورشید نے اس کا میک اَپ کر کے دُلہن بنا دیا۔ ساجدہ کو تو یہ بھی یاد نہ آیا کہ اس نے وہی غرارہ سُوٹ پہنا تھا جو سلیمہ کبھی کبھی شادیوں کی تقریب میں پہن کر جایا کرتی تھی۔ لاکٹ اور ٹوپس بھی وہی تھے جو سلیمہ ہر وقت پہنے رہتی تھی۔

جب وُہ تیار ہو گئی تو ایک پیاری سی عورت نے اس کے ماتھے پر جڑاؤ ٹیکہ سجا دیا، اور سلیمہ نے چپکے سے ساجدہ کو بتایا کہ ناظم بھیّا کے سب سے پیارے

دوست کی بیوی صابرہ ہیں۔

"کیا یہ میرا نام ہے سلیمہ باجی؟" وہ ٹیکے کو چھوتے ہوئے بڑبڑائی اور سلیمہ نے اسے زور سے لپٹا لیا۔

پھر کیا ہوا، اسے کچھ یاد نہ تھا۔ اس کا ذہن جیسے گہری نیند سو گیا تھا۔

جب کار گھر کے پھاٹک میں داخل ہوئی اور ناظم نے اسے سہارا دے کر اتارا تو اس کا ذہن پوری طرح جاگ اٹھا تھا۔ شام رات کا لباس پہن رہی تھی۔

گیلری میں داخل ہوتے ہی اس نے جھکا ہوا سر پوری طرح اٹھا لیا۔ آج وہ اس گھر میں ناظم کی بیوی کی حیثیت سے داخل ہوئی تھی۔ خالہ بی کے کمرے سے کاظم کے زور زور سے بولنے اور قہقہے لگانے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ میز پر چائے کا سامان چنا ہوا تھا اور تاجی گوٹے سے سجی ہوئی ٹوکری سے لڈو نکال نکال کر پلیٹوں میں رکھ رہی تھی۔

شکر ہے آپ لوگ آ گئے، آپ ہی کا انتظار ہو رہا تھا۔ آج کاظم میاں کے ساتھ لڈوؤں کے دو ٹوکرے آئے ہیں۔ وہ بڑے جوش سے بول رہی تھی، پھر ایک دم چونک پڑی۔ "ساجدہ باجی! کہیں شادی میں گئی تھیں آپ! اور آپ سلیمہ باجی ایسے ہی سادی سودی چلی گئیں۔" وہ سخت حیران نظر آ رہی تھی "صبح کے گئے اب آئے ہیں آپ لوگ! مارے فکر کے خالہ بی کا برا حال ہو رہا تھا۔" وہ ٹکر ٹکر ساجدہ کو دیکھنے لگی۔

"ذرا جلدی سے گرم گرم چائے تیار کرو تاجی! ہم ابھی آتے ہیں۔" ناظم نے کہا اور تاجی کا جواب سنے بغیر وہ اماں بی کے کمرے میں چلے گئے۔

ساجدہ کو لپٹا کر وہ مارے خوشی کے رو پڑیں۔ ساجدہ نے ان کے سینے سے لگ کر رونا چاہا مگر اسے ایسا محسوس ہوا کہ اس کی آنکھیں آنسوؤں کی ایک ایک بوند کو ترس رہی ہیں۔

"جاؤ، چائے پیو، تم لوگوں نے بہت دیر کر دی آنے میں، سب بہت پریشان تھے۔" تاجی کہہ رہی تھی کہ مالک اور چھوٹی بیگم نے صبح سے نہ کچھ کھایا نہ پیا۔

وہ تینوں کمرے سے باہر نکلے ہی تھے کہ خالہ بی جیسے بھاگتی ہوئی آئیں اور ایک دم رو پڑیں "کہاں تھیں صبح سے؟ مجھ سے کہہ کر کیوں نہیں گئے تم لوگ؟" وہ سلیمہ کو بیتابی سے لپٹانے کو بڑھی تھیں مگر وہ اس طرح پیچھے ہٹ گئی جیسے اس نے اپنی ماں کو اپنی طرف بڑھتے دیکھا ہی نہیں۔

"ہم لوگ شادی میں گئے تھے، چلئے چائے پیجئے۔" سلیمہ ساجدہ کا ہاتھ تھامے کھانے کے کمرے میں چلی گئی اور ساجدہ کو اپنے ساتھ والی کرسی پر بٹھا کر یوں ہی اِدھر اُدھر کی باتیں کرنے لگی، اس نے دیکھا بھی نہیں کہ اس کی ماں سائے کی طرح ساتھ ہے۔

"اور تم شادی میں اسی طرح چلی گئیں! اپنے کپڑے اسے پہنا دیے، تم نے مجھ سے کہا ہوتا تو اپنا پرانا غرارہ اسے دے دیتی۔" وہ گھور گھور کر ساجدہ کو دیکھ رہی تھیں۔

"تاجی! چائے۔" سلیمہ نے چیخ کر کہا۔

"ذرا صبر کریں سلیمہ باجی! اتنا کیوں چیختی ہیں!" کاظم ہنستا ہوا کمرے میں آیا۔ مگر ساجدہ کو دیکھ کر حیران کھڑا رہ گیا۔

"بیٹھ جاؤ کاظم! پاؤں تھک جائیں گے کھڑے کھڑے۔ اور پھر تم کو بٹھانے کے لئے مجھے اور چیخنا پڑے گا۔"

کاظم جیسے جھینپ کر کرسی پر بیٹھ گیا مگر ذرا ہی دیر میں اس کی نظریں پھر ساجدہ کے چہرے پر گڑ گئیں۔

ناظم اور سلیمہ بڑے سکون سے چائے پی رہے تھے۔

ساجدہ ایک دم کھڑی ہو گئی۔ اس نے کاظم کی گھورتی ہوئی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں۔

"تم، کاظم! اتنے بدتمیز ہو کہ یہ تک نہیں جانتے کہ اپنی بھاوج کو کس طرح دیکھنا چاہیے! تم کو سلام کرنے کی بھی تمیز نہیں ہے۔"

"بھاوج!" خالہ بی کرسی سے اس طرح اچھل پڑیں جیسے کمرے میں بم کا دھماکہ ہوا ہو۔ ذرا دیر کے لیے کاظم، تاجی اور خالہ بی پتھرائی ہوئی آنکھوں سے ساجدہ کو دیکھتے رہے۔

"ہاں بھاوج، خالہ بی! بھاوج ———" آج اس کی آواز میں غرور تھا۔ "اپنے لاڈلے کو تمیز سکھائیے، ورنہ میں اس کا منہ توڑ دوں گی۔" کاظم کی نظریں میز پر جھکی ہوئی تھیں۔

"تاجی! مالک کہاں ہیں؟ انھیں بلاؤ، وہ کہاں ہیں؟ یہ کیسا ڈرامہ ہے؟" خالہ بی کی آواز میں فریاد تھی۔

تاجی دوڑتی ہوئی کمرے سے نکل گئی۔

میں نے بچپن سے گھر میں اتنے ڈرامے دیکھے ہیں خالہ بی کہ جی بھر گیا۔ اسکول یا کالج کے ڈراموں میں کبھی حصہ ہی نہیں لیا۔" ناظم نے جیب سے نکاح نامہ نکال کر

میز پر پھیلا دیا۔ کاظم نے ایک نظر نکاح نامے کو دیکھا اور پھر خاموشی سے چائے پینے لگا۔

مالک جیسے ہی کمرے میں داخل ہُوئے تو خالہ بی رو پڑیں "کیا ہم اپنے برابر کے لوگوں میں شادی نہیں کر سکتے تھے، مگر ناظم نے ——"

"ایک ایماندار منشی کی بیٹی سے شادی کر لی۔" ساجدہ نے حقارت سے خالہ بی کی طرف دیکھا۔

"کیا یہ سچ ہے ناظم؟" مالک بہت سنجیدہ تھے۔

"ہاں مالک! مجھے ساجدہ سے محبت ہے، میں نے اس سے شادی کر لی۔ آپ کو تو معلوم ہے کہ محبت میں سب کچھ جائز ہوتا ہے، میں آپ سے اجازت نہ لے سکا، میں سمجھتا ہُوں کہ محبت کے معاملات میں کسی کی اجازت، خوشی یا ناخوشی کا دخل نہیں ہوتا۔"

"خدا تم دونوں کو خوش رکھے۔" وہ خاموشی سے کمرے سے نکل گئے، ساجدہ کو ان پر رحم آنے لگا۔ "انسانوں کے کردار کا محاسبہ ساری زندگی پیچھا نہیں چھوڑتا۔"

"ہاں بھائی! فکر ہر کس بقدر ہمت اوست۔ مت روئیے خالہ بی! مٹھائی کھائیے۔ تاجی! میرے بھائی میاں اور بھابی صاحبہ کو بھی مٹھائی کھلاؤ۔"

"میں تمہاری فکر کی پہلی رشوت کو چکھنا بھی نہیں چاہتا۔"

"شاید اب ہم ایک ساتھ نہ رہ سکیں گے بھائی میاں!" کاظم کا چہرہ سُرخ ہو رہا تھا۔

"مجھے معلوم ہے۔" ناظم نے سکون سے جواب دیا۔ "تین کمروں کے چھوٹے سے سرکاری کوارٹر میں رہنے والے تمہارے بھائی میاں کا یہاں جی بھی نہیں لگتا۔"

"اور مجھے تو تم سب کے ساتھ رہتے ہوئے یہ احساس ہوتا جیسے کسی نے میرے کلیجے کو جکڑا ہوا ہے۔" سلیمہ نے آہستہ سے کہا تو خالہ بی نے اس کی طرف درد بھری نظروں سے دیکھا اور دونوں ہاتھوں سے مُنہ چھپا لیا۔ وہ گُھٹی گُھٹی سسکیاں لے رہی تھیں۔

ناظم اُٹھا اور کمرے سے نکل گیا۔

"سب لوگ یہاں سے چلے جائیں۔" ساجدہ زور سے چیخی اور اُٹھ کر خالہ بی کے گلے میں باہیں ڈال کر ان کا سر سینے سے لگا لیا۔ ناظم اور سلیمہ اس طرح اُٹھ کر چلے گئے جیسے اسکول کے بچّے ماسٹر کے حکم کی تعمیل کرتے ہیں۔

خالہ بی دیر تک ساجدہ کے سینے سے لگی سسکیاں بھرتی رہیں اور ساجدہ سوچتی رہی محبت کا یہ رُوپ کتنا اذیت ناک ہوتا ہے، جب وہ طعنہ بن کر لوگوں کی زبان پر چڑھ جاتی ہے۔

خالہ بی روتے روتے تھک گئی تھیں، وہ اب کرسی کی پشت سے سر ٹکائے آنکھیں بند کیے، جانے کیا سوچ رہی تھیں۔ ساجدہ نے جُھک کر اُن کی روتی ہوئی آنکھوں کو آہستہ سے چوم لیا اور دبے قدموں کمرے سے نکل گئی۔

رات کا اندھیرا ہر طرف پھیل چکا تھا۔ گیلری کے بلب اندھیرے میں ڈوبے ہُوئے تھے، آج کسی کو روشنی کرنا بھی یاد نہیں رہا تھا۔ وہ آہستہ آہستہ سوئچ آن کرنے لگی۔ اس نے دیکھا کہ گیلری کے ایک کونے میں تاجی گُھٹنوں میں سر دیے بیٹھی ہے، روشنی ہوتے ہی وہ تیزی سے اُٹھ کر چلی گئی۔

شادی کو ایک ہفتہ گزر گیا تھا مگر کاظم گھر واپس نہیں آیا تھا۔ سب کو معلوم تھا کہ کیوں ؟

خالہ بی پاگلوں کی طرح ادھر ادھر پھرتیں۔ وہ آہستہ آہستہ بڑبڑاتیں "تم نے سب کچھ ختم کر دیا ناظم، میرے بیٹے !" وہ بہت کمزور لگنے لگی تھیں۔ ان کے جسم میں ہر وقت درد رہنے لگا تھا۔ تاجی گھنٹوں دباتی مگر درد جانے کا نام نہ لیتا، جب وہ گھر کے کسی کام سے اُٹھتیں تو ساجدہ ان کا ہاتھ پکڑ لیتی۔ وہ کچھ نہ بولتیں اور پھر بستر پر لیٹ جاتیں۔

"مکان مل گیا ہے خالہ بی!" ساجدہ نے ایک دن انھیں دلاسہ دیتے ہوئے کہا "کل ہم چلے جائیں گے، پھر کاظم روز آئے گا، آپ پریشان نہ ہوں۔"

"میرے جسم کے کتنے ٹکڑے ہوں گے ؟" خالہ بی نے بڑے دُکھ سے کہا۔ ساجدہ نے کوئی جواب نہ دیا۔ وہ اُٹھ کر ناظم کے کمرے میں چلی گئی اور بندھے ہوئے سامان کے چھوٹے بڑے بنڈل دیکھنے لگی جو فرش پر بے ترتیبی سے بکھرے ہوئے تھے جس گھر کو چھوڑنے کی اس نے کتنی دھمکیاں دی تھیں۔ آج اس گھر سے جانے کا تصور اس کے کلیجے کو کاٹ رہا تھا۔

صبح جب ریڑھے پر سامان رکھا جا رہا تھا تو وہ سوچ رہی تھی کہ کیا وہ سب سے رخصت ہو سکے گی، کیا وہ اس اذیت کو برداشت کر سکے گی؟ مگر ناظم جب تانگہ لے کر آیا تو یہ مرحلہ اس آسانی سے ختم ہو گیا جیسے کوئی بات ہی نہ تھی۔ اس نے کسی کی طرف نظر اٹھا کر دیکھا ہی نہیں۔ امّاں بی اور خالہ بی کے آنسوؤں کو اس نے صرف اپنے کپڑوں میں جذب ہوتے محسوس کیا۔ تاجی کی سسکیاں سائیں سائیں کرتے گزر گئیں اور سلیمہ تو غسل خانے میں تھی۔ دیر تک اس کا انتظار کرنے کے بعد وہ تانگے میں بیٹھ گئی۔ مالک خدا حافظ کہنے کے لیے تانگے کے پاس کھڑے ہوئے تھے۔ وہ اس طرح جھوم رہے تھے جیسے زمین پر ان کے پاؤں نہ ٹک رہے ہوں۔ آج انہوں نے صبح سویرے ہی پی لی تھی۔ ان کی سُرخ سُرخ آنکھیں اُبلی پڑی تھیں۔

پرانی سی کوٹھی کے دو کمروں کے پورشن میں جب سامان قاعدے سے لگا کر اس نے فرصت پائی تو شام ہو چکی تھی، وہ پلنگ پر بیٹھی تو اداسی ہر طرف سے در آئی، کہیں قریب سے بچّوں کے کھیلنے کی آواز سُنائی دی تو اس نے دروازے میں کھڑے ہو کر باہر دیکھا ایک سلسلے میں بنی ہوئی پانچ کوٹھیوں کے راستے کو چھوڑ کر ایک نیچی سی کچی دیوار تھی، اس کی پرلی طرف بہت سے کچّے مکان تھے، ان میں سے دُھواں بل کھاتا ہوا اڑ رہا تھا۔

ساتھ والی کوٹھی کے لان میں خوب صورت آرام کرسیاں رکھی تھیں - ان میں سے ایک پہ بھاری بھرکم ایک گورا چٹّا آدمی بیٹھا تھا اور دوسری پہ ایک دُبلی سی عورت جو بے حد خوشامدانہ لہجے میں باتیں کر رہی تھی۔ مرد کے تیور بہت خراب ہو رہے تھے، اس نے گھبرا کر دروازہ بند کر دیا اور بستر پہ لیٹ گئی "آج تو ناظم کو جلد گھر آجانا چاہیے تھا" اس نے یوں ہی سوچا، ذرا دیر بعد دروازے پر کسی نے دستک دی۔ اس نے اٹھ کر دروازہ کھول دیا۔

"کون ہو؟"

"ساتھ والی کوٹھی سے آیا ہوں بی بی جی! ہماری بیگم صاحبہ نے کھانا

بھجوایا ہے اور کہا ہے کہ کسی چیز کی ضرورت ہو تو بتا دیں وہ کل آپ سے ملنے آئیں گی۔"

"میرا سلام کہنا اور شکریہ ادا کرنا" اس نے ٹرے لے کر اندر رکھ لی۔ دروازہ بند کرتے ہوئے اس نے سوچا "یہ کون لوگ ہیں پتہ نہیں کیسے ہوں گے؟" اسے تو کھانا پکانا یاد ہی نہ رہا تھا۔ تھوڑی دیر بعد ناظم آگیا، وہ شرمندہ سا تھا۔

"ایک میٹنگ ہو رہی تھی، اس لیے دیر ہو گئی، معاف کرنا ساجدہ بی بی!"

"ساتھ والی کوٹھی سے کھانا آیا ہے، یہ کون لوگ ہیں؟"

"بہت بڑے زمیندار ہیں، زمینداروں میں ایک قسم کی وضعداری تو ہوتی ہے نا" وہ ہنس پڑا "اس ایک بات کے سوا ان میں اور کیا ہوتا ہے۔ لاؤ پھر کھانا کھلاؤ۔"

ساجدہ نے ٹرے اٹھا کر تپائی پر رکھ دی ناظم کھانے کے دوران بہت سی باتیں کرتا رہا اور وہ خاموشی سے سنتی رہی، ناظم شاید اس بات کا عادی ہو چکا تھا کہ وہ بولتا رہے اور ساجدہ سے جواب کی توقع نہ رکھے، وہ صرف اس وقت کچھ کہتی جب کوئی ضروری بات ہوتی۔

انہیں نئے گھر میں آئے تین مہینے ہو چلے تھے مگر مالک کے ہاں سے کوئی بھی خبر لینے نہیں آیا تھا۔ سلیمہ نے بھی پلٹ کر نہیں پوچھا تھا، اسے سخت حیرت تھی کہ وہ سب اسے بھول کیسے گئے؟ اس کا کیسا کیسا جی چاہا کہ وہ خود چلی جائے مگر کس طرح؟ کاظم تو اس کی صورت بھی دیکھنے کا روادار نہیں تھا وہ اپنے گھر میں اس کی موجودگی کہاں برداشت کرے گا!

ناظم ہر دوسرے دن اماں بی سے اور سلیمہ سے ملنے جاتا اور اس کے پوچھے بغیر

وہاں کا سب حال بتانے لگتا۔

"سلیمہ کو جانے کیا ہو گیا ہے، اس میں وہ پہلی سی بات نہیں رہی" وہ رنجیدہ ہو کر کہتا "خالہ بی بہت کمزور ہو گئی ہیں، مجھے دیکھتے ہی رونے لگتی ہیں، اماں بی تو اپنی دنیا میں گم رہتی ہیں، مالک اب بہت پینے لگے ہیں، کاظم نے ایک باغ ان کے نام سے الاٹ کرا لیا ہے، تم اب کوٹھی کو دیکھو تو پہچان نہ سکو، ایک مالی ہر وقت دونوں لانوں میں کام کرتا رہتا ہے، تاجی اب صرف اوپر کا کام کرتی ہے، کھانا پکانے کے لیے ایک خانساماں رکھ لیا گیا ہے، پھلوں کے ٹوکرے کھانے کے کمرے میں لڑھکتے پھرتے ہیں، تاجی تم کو بہت پوچھ رہی تھی، کہہ رہی تھی کہ کسی دن اسے تمہارے پاس لے آؤں، وہ اب پہلے کی طرح وہاں خوش نہیں ہے، مجھے تو وہ گھر اتنا اجنبی لگتا ہے ساجدہ، جیسے میں وہاں کبھی رہا ہی نہیں، ہمارا یہ دو کمروں کا گھر ان کی جنّت کے مقابلے میں کتنا ——— !"

مگر یہ باتیں بار بار سنتے ہوئے بھی ساجدہ یہی سوچتی رہتی، کیا ہوا ہے سلیمہ کو، وہ کیسے بدل گئیں، کیسے ؟

زمیندار کی بیوی کا نام لالی تھا اور اس سے ساجدہ کی خاص دوستی ہو گئی تھی وہ معمولی سی پڑھی لکھی تھی اور ساجدہ سے بہت متاثر ہو گئی تھی، پھر اس کی زندگی بھی عجیب تھی، زمیندار صاحب کو جب زمین کے ان آٹھ مربعوں کا خیال آتا جو لالی کے باپ نے وعدہ کر کے جہیز میں نہیں دیے تھے تو وہ سارا غصہ لالی پر نکالتے، اسے جی بھر کر مارتے۔ مار کھانے کے بعد وہ عموماً ساجدہ کے پاس آ جاتی، اپنے جسم پر تازہ تازہ نیل دیکھ کر خوب روتی اور پھر اپنے باپ کو کوسنے لگتی۔

لالی ساجدہ کو بتا چکی تھی کہ اس کے باپ نے جلدی جلدی میں اس کی شادی کر دی تھی۔ شادی سے پہلے اس نے اپنے ہونے والے داماد کو خوب سبز باغ دکھائے تھے اور بہت کچھ جہیز میں دینے کا وعدہ کر لیا تھا۔ جہیز میں وہ مربعے اور کار تو کیا دیتا، اسے تو بس اپنی آخری بیٹی سے چھٹکارا پانا تھا۔ اس کی شادی کے چند روز بعد اس نے خود ایک جوان پڑھی لکھی عورت سے شادی کر لی اور لالی کی ماں کو آبائی حویلی میں چھوڑ کر شہر آ گیا۔

"تم بڑی بہادر ہو لالی! اتنی مار کھانے کے بعد اس گھر میں رہتی ہو اور زمیندار صاحب سے محبت بھی کرتی ہو، دیکھنے میں وہ کتنے مہذب اور اچھے لگتے ہیں پھر بھی ایسی حرکتیں کرتے ہیں!"

"وہ آپ کی بیحد تعریف کرتے ہیں، آپ کی مثال دیتے ہیں اور کہتے ہیں ساجدہ تو میری بہن ہے۔"

"مگر وہ اپنی بہن کی دوست کے ساتھ ایسا سلوک کرتے ہیں؟"

"نہیں، بس غصے کے برے ہیں اور میرے باپ نے بھی تو اچھا نہیں کیا انہیں دھوکا دیا" وہ فوراً صفائی پیش کرتی "میں ایسے گھر میں بھی تو نہیں رہ سکتی، جیسے گھر میں آپ رہتی ہیں آپا! میں تو اپنے پاؤں بھی خود نہیں دھوتی۔ آپ نے دیکھا ہے نا! ہمارے ہاں کتنے نوکر ہیں، ایک لڑکی تو صرف میرے پاؤں دھلانے پر مقرر ہے۔" وہ فخر سے سر اونچا کر کے کہتی۔ "ویسے مجھے کبھی کبھی خیال آتا ہے کہ ناظم بھائی کتنے اچھے ہیں، وہ آپ سے محبت کرتے ہیں، آپ کی عزت کرتے ہیں۔"

ساجدہ اس کی احمقانہ باتیں سن کر ہنس دیتی، اسے لالی پر بڑا رحم آتا،

یہاں لے دے کر ایک لالی ہی تھی جو اس کی تنہائی کی ساتھی تھی، ہمدردی کے ساتھ وہ اب اُسے اچھّی بھی لگنے لگی تھی۔

شادی کو پانچ مہینے ہو گئے تھے مگر ایک دن بھی ایسا نہ گزرا جب پرانی یادوں نے اُسے نہ ستایا ہو، ایک بھی رات ایسی نہ تھی جب وہ سونے کو لیٹی ہو اور صلاح الدّین کے خیال کی تلوار اس کے سر پر نہ جھولنے لگی ہو، وہ کوشش کرتی اور خالی الذہن ہو کر گھر کے کاموں میں جُٹ جاتی مگر دو کمروں کے مکان میں کتنا کام ہوتا ہے، لالی کے ہاں جب کبھی گاؤں سے مہمان آجاتے تو وہ بھی آٹھ آٹھ دس دس دن صورت نہ دکھاتی۔ تنہائی اور بیکاری اسے اور پریشان کر دیتی، شام تک وہ تھکن سے اس طرح چُور ہو جاتی جیسے سارا دن اس نے بھاگ بھاگ کر گزارا ہو۔ ایک روز اس نے تنگ آکر ناظم سے کہا کہ اسے بی۔ ٹی میں داخل کرا دے، ناظم نے بحث کیے بغیر اس کی خواہش پُوری کر دی۔ اب وہ صبح سویرے ناظم کے ساتھ ہی گھر میں تالہ لگا کر کالج چلی جاتی اور جب واپس آتی تو گھر کے تھوڑے بہت کام میں ہی شام ہو جاتی۔ اس طرح اپنے حساب وہ یادوں کے کچوکوں سے کسی حد تک بچ گئی تھی۔ مگر لالی خوش نہیں تھی، وُہ اس کے کالج جانے پر روٹھی سی رہتی وہ کئی بار ضد کرتی کہ "کل سے کالج چھوڑ دیں آپا! آپ کے بغیر میں بے حد رنجیدہ رہتی ہُوں، مجھے یُوں لگتا ہے جیسے میرا کوئی بھی نہیں ہے۔"

ساجدہ ہنس کر کہتی "تم نو دس بجے اُٹھتی ہو، گیارہ بجے تک پاؤں دھلواتی ہو، اور ایک بجے تک نوکروں سے کام لیتی ہو، اس کے بعد تمہیں فرصت ملتی ہے، میں اتنی دیر میں کالج سے واپس آجاتی ہُوں!"

وہ صرف یہ کہہ کر خاموش ہو جاتی "پتہ نہیں کیوں میرا جی نہیں چاہتا کہ آپ کالج جائیں اور آپ کے دروازے پر تالا پڑا ہو۔"

آج جب وہ کالج سے واپس آئی تو اس کے گھر کے اردگرد پندرہ بیس آدمی کھڑے تھے۔ وہ سب سفید کپڑوں میں ملبوس تھے۔ ان کے گھُورنے اور کھڑے ہونے کا انداز ان کی جیلوں کی طرح ایک سا تھا۔ ساجدہ کو دیکھ کر انہوں نے راستہ دے دیا۔ وہ دروازے کے پاس پہنچی تو اُن میں سے ایک نے ادب سے پُوچھا "بیگم صاحبہ! آپ کو معلوم ہے اس وقت ناظم صاحب کہاں ہوں گے!" اس کے نرم لہجے اور کرخت چہرے میں کوئی نسبت نہیں تھی۔

"مجھے معلوم نہیں، شاید کالج میں ہوں گے۔" اس نے تالا کھولا

"وہ کالج میں نہیں ہیں۔" دُوسرے آدمی نے کہا

"پھر مجھے معلوم نہیں کہ کہاں ہوں گے۔ پانچ چھ بجے گھر آجاتے ہیں، اس وقت آکر مل لیجئے گا۔"

"ٹھیک ہے ہم یہیں ان کا انتظار کریں گے۔"

"آپ لوگ چاہیں تو بیٹھک میں آجائیے۔"

"شکریہ! ہم لوگ باہر ہی انتظار کر لیں گے۔" وہ دروازے کے پاس سے ہٹ گئے، اور وہ یہ سوچتی ہوئی اندر چلی گئی کہ ناظم سے اتنے بہت سے لوگوں کو

کیا کام ہو سکتا ہے۔

وہ ابھی کپڑے تبدیل کر کے باورچی خانے کی طرف جانے ہی لگی تھی کہ ایک دم دروازہ کھلا اور زمیندار صاحب اندر آ گئے۔ انھیں اس طرح آتے دیکھ کر ساجدہ کو بڑی حیرت ہوئی، وہ اس سے پہلے جب بھی آئے ناظم کے ساتھ آئے یا لالی کے ساتھ۔ پھر بھی اس نے اخلاقاً انہیں بیٹھنے کے لیے کہا۔

"بہن! یہ پولیس کے لوگ ہیں، ان کی گاڑیاں دُور سڑک پر کھڑی ہیں ان میں سے کئی تو میرے ٹکڑوں پر پلنے والے ہیں اس لیے ان کی ہمت نہیں پڑی کہ تم سے بات بھی کریں۔"

"مگر یہ چاہتے کیا ہیں؟"

"ناظم صاحب کو گرفتار کرنے آئے ہیں ڈیفنس آف پاکستان رولز کے تحت، مجھے آپ کی فکر تھی، اس لیے کہیں گیا نہیں۔"

اس نے ایک لمحے کو فخریہ نظر سے زمیندار صاحب کو دیکھا، پھر نظریں جھکالیں "پاکستان کی بقا کے لیے جیل جا رہے ہیں تو پھر کوئی بات نہیں بھائی!"

"میں نے ان سے کہا کہ دو چار ہزار لے لو اور چلتے بنو۔" زمیندار نے اس کی بات سنی ان سنی کرتے ہوئے کہا "مگر وہ ڈرتے ہیں کہ معاملہ اُوپر کا ہے، اگر انہوں نے ناظم صاحب کو گرفتار نہ کیا تو نوکری سے نکال دیئے جائیں گے۔ اب سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا جائے؟"

زمیندار صاحب سخت پریشان تھے اور وُہ حیران تھی کہ جو شخص زمین کے چند مربعوں کے لیے اپنی بیوی کی ٹھکائی کرتا ہے، نوکروں کو ذرا سی غلطی پر انہیں جوتے

مارتا ہے، وہ جسے بہن کہتا ہے اس کی خاطر دو چار ہزار روپے خرچ کرنے کو تیار ہو جاتا ہے۔ وُہ ابھی سوچ ہی رہی تھی کہ ناظم آ گیا۔ وہ ہنس رہا تھا۔

"تم پریشان تو نہ ہو گی ساجدہ بی بی! میری اٹیچی میں چند جوڑے کپڑے رکھ دو۔"

"نہیں —— بالکل نہیں"۔ ساجدہ نے بڑے عزم سے جواب دیا، اور تیزی سے اٹیچی میں کپڑے رکھنے لگی۔ زمیندار صاحب ان دونوں کو اتنا پرسکون دیکھ کر حیران تھے، جب ناظم جانے لگا تو کوٹھیوں کے دروازوں میں اور احاطے کی کچی دیوار پر سر ہی سر نظر آ رہے تھے۔

زمیندار صاحب احاطے کی طرف مُنہ کر کے دھاڑے "اوتے، حرام کی اولادو! ناظم صاحب چوری میں نہیں پکڑے جا رہے، یہ سیاست کے قیدی ہیں، سُنا یہ سیاسی قیدی ہیں، سیاسی۔" سارے سر دیوار کے پیچھے دبک گئے۔

ساجدہ اس وقت تک دروازے سے لگی کھڑی رہی جب تک ناظم نظروں سے اوجھل نہ ہو گیا۔

"پولیس والوں نے بتایا ہے کہ ناظم صاحب کو شاہی قلعے میں جا رہے ہیں پُوچھ گچھ کے لیے۔" زمیندار صاحب نے آہستہ سے ساجدہ کو بتایا۔

"شاہی قلعہ!" وہ حیران تھی

"ہاں بہن! وہاں بڑے بڑے لیڈروں کو بند کیا جا چکا ہے، کہتے ہیں ان کی بڑی خاطر تواضع ہوتی تھی انگریزوں کے زمانے میں!" وہ باہر جاتے جاتے ایک لمحے کو ٹھہر گئے "بہن! رات تمہارے پاس آپا سویا کرے گی، گھبرانا نہیں۔"

اس نے دروازہ بند کر لیا۔ سناٹے کی گھر سارے گھر میں بھر گئی۔ وہ خاطر تواضع کا مطلب اچھی طرح سمجھ گئی تھی، اس کا جسم لرز رہا تھا، اس کا جی اس زور سے مالش کر رہا تھا کہ وہ غسل خانے میں چلی گئی۔ قے کرنے کے بعد ذرا سا سکون ہوا تو بستر پر آ کر لیٹ گئی، اس وقت اُسے خیال آیا کہ اس نے ناظم کو کچھ نہیں بتایا، کتنی لاپروائی ہے، وہ اسے یہ خوشی بھی نہ دے سکی، اب نہ جانے کب اس سے مل سکے گی۔

لالی شام کو آئی، وُہ فکر مند تھی، وُہ ایک بات بار بار دُہرا رہی تھی، "ناظم بھائی کن اُلٹے کاموں میں پڑ گئے ہیں! انسان کھاتے پیئے اور آرام سے رہے چار دن کی زندگی بے کار کاموں میں ضائع کرنے کا فائدہ؟"

ساجدہ اس کی باتیں خاموشی سے سنتی رہی، اور پھر لالی اس طرح اسے تسلّی دیتی ہوئی چلی گئی جیسے وہ دو سال کی بچی ہو۔ صبح اخبار میں گرفتاریوں کی خبر چھپی ہوئی تھی، صرف ناظم کا نام نہیں تھا گرفتار ہونے والے بہت سے لوگ تھے، کچھ نام ایسے بھی تھے جو اس نے ناظم کی زبانی سُنے تھے۔

الٹا سیدھا ناشتہ کر کے وہ معمول کے مطابق کالج چلی گئی اور جب واپس آئی تو برآمدے میں پڑی ہوئی اکلوتی کرسی پر خالہ بی بیٹھی اس کا انتظار کر رہی تھیں اسے دیکھتے ہی وہ اس کی طرف لپکیں اور اسے لپٹا لیا۔ وہ پھُوٹ پھوٹ کر رو رہی تھیں۔ ساجدہ انہیں لاکھ تسلّی دے رہی تھی مگر وہ تو جیسے گیلی ریت پر پڑی ہوئی مچھلی کی طرح تڑپ رہی تھیں، ان کی بس ایک ہی ضد تھی "گھر کو تالا لگاؤ اور میرے ساتھ چلو۔" ساجدہ ان کے ساتھ جانا نہیں چاہتی تھی، وہ اس گھر میں کیسے جائے

جسے کاظم اس کی وجہ سے چھوڑ کر چلا گیا تھا۔

"میں نہیں چاہتی کہ کاظم کو پھر گھر چھوڑنا پڑے۔" اس نے خالہ بی کو سمجھانا چاہا۔

"کیا تم اسے اتنا بُرا سمجھتی ہو، خبر پڑھ کر وہ بہت پریشان ہو گیا تھا، وُہ اپنے بھائی کی رہائی کے لیے سب کچھ کرے گا، اسے میں نے پالا ہے، وہ بُرا کیسے ہو سکتا ہے!"

لالی اور زمیندار صاحب اسے رخصت کرنے آئے۔ انہوں نے اطمینان دلایا کہ گھر کی حفاظت ان کا چوکیدار کرے گا۔

لالی اسے گلے ملی تو ساجدہ نے اپنے شانے پر اس کے گرم گرم آنسو گرتے ہوئے محسوس کیے، وہ جیسے سرگوشی میں کہہ رہی تھی اب تو ظالم مارے گا اور رونے کے لیے کوئی جگہ بھی نہیں ملے گی۔

گھر میں سب اس کا انتظار کر رہے تھے۔ سوگ کی عجیب سی فضا طاری تھی، اماں بی نے اسے لپٹایا تو رنجیدہ ہونے کے باوجود ان کی آنکھوں میں فخر تھا، انہوں نے بتایا کہ ناظم پاکستان بننے سے پہلے بھی چھ مہینے جیل میں رہا تھا۔ ایک بار کانگرسیوں نے بھی اسے گرفتار کرا دیا تھا، مگر وہ ایک ہفتے بعد رہا ہو گیا تھا۔

مالک نے اُسے اپنے کمرے میں بُلایا۔ ان میں اُٹھنے کی سکت ہی نہیں تھی، وہ صبح سے پی رہے تھے، اسے دیکھ کر انہوں نے بچّوں کی طرح رونا شروع کر دیا۔ وہ ایک ہی بات بار بار دُہرائے جا رہے تھے "کاش ناظم بھی کاظم کی طرح ہوتا اس نے مجھے بہت دُکھ دیے ہیں۔"

اسے مالک کی حالت دیکھ کر دُکھ ہو رہا تھا، انہوں نے اتنی پی رکھی تھی کہ زبان لڑکھڑا رہی تھی۔ ان کا مسخ چہرہ اونٹ کی تھوتھنی کی طرح لٹک رہا تھا۔ اس کا جی چاہا کہ انہیں جھنجھوڑ کر پھینک دے۔ زندگی کی حقیقتوں سے فرار کا یہ گھٹیا انداز تو انسان کی شخصیت پر جونک کی طرح چپک جاتا ہے۔

کمرے میں اتنی بدبُو پھیلی ہُوئی تھی کہ اس کا جی متلانے لگا۔ خالہ بی مالک کی حالت دیکھ کر انھیں سمجھا رہی تھیں "خدا کے لیے اپنے حال پر رحم کیجیے،

شراب نے آپ کی صحت کو کھا لیا ہے۔"

"اس وقت آپ ان سے کیا کہہ رہی ہیں، یہ کچھ نہیں سمجھ سکتے۔"

"ساجدہ بیٹی! میں پاپن تو ایسی جلی جو نہ کوئلہ ہوئی نہ راکھ"۔ وہ مالک کے آنسو پونچھ رہی تھیں اور اُن کی رٹ جاری تھی "کاش ناظم بھی کاظم کی طرح ہوتا، اس نے مجھے بہت دُکھ دیئے ہیں۔"

ساجدہ گھبرا کر باہر نکل آئی، سلیمہ کے کمرے میں گئی مگر وہ خالی تھا۔ تاجی سے ملنے باورچی خانے کی طرف چلی تو وہ راستے میں مل گئی اور دوڑ کر ساجدہ سے لپٹ گئی "ناظم میاں تو کہتے تھے، تاجی! تجھے اپنے گھر لے چلوں گا، اور اب وہ خود جیل چلے گئے، مجھے یہاں سے کوئی نہیں لے جاتا باجی! کوئی نہیں لے جاتا، آپ تو لے چلیں گی نا، آپ تنہا ہوں گی"۔

"ابھی تو میں خود یہاں آگئی ہوں، تاجی! یہ بتاؤ، سلیمہ کہاں ہیں؟"

"سلیمہ باجی" وہ سرگوشی میں کہنے لگی "وہ تو مشکل سے گھر آتی ہیں، جب سے آپ لوگ گئے ہیں، ان کا وقت اپنی سہیلیوں میں گزرتا ہے، اب انہوں نے نوکری کر لی ہے تو کہتی ہیں کہ کالج میں ہی رہیں گی۔"

"ہوسٹل میں؟"

"ہاں وہیں۔"

گھر میں اب امیرانہ ٹھاٹ ہی نظر نہیں آنے لگے تھے، سب کچھ ہی جیسے بدل گیا تھا۔

وہ سلیمہ کے کمرے میں جا کر لیٹ گئی، شراب کی بدبو ابھی تک اس کے دماغ میں

بسی ہوئی تھی، اُس کا جی بھی متلا رہا تھا، اسے اتنے زور کی ابکائی آئی کہ خالہ بی کے حسّاس کانوں نے سُن لی، وہ بھاگی ہوئی کمرے میں آگئیں۔

"تمہارا جی متلا رہا ہے" ان کی آنکھوں میں مسرت کی چمک تھی "اور چکر بھی آتے ہیں؟"

"جی۔" اس نے نظریں جھکا کر جواب دیا

"اری تاجی کہاں ہے، آدھا لیموں کاٹ کر اور اس پر نمک چھڑک کر لے آ۔" خالہ بی نے گیلری میں جا کر آواز دی اور پھر اندر آگئیں۔

"مجھے کھٹّی چیزوں سے نفرت ہے خالہ بی۔" ساجدہ نے بیچارگی سے کہا

"شرماتے نہیں بیٹی! لو میں ہٹی جاتی ہوں، خدا میرے ناظم کو جلد رہائی دلائے"

وہ ایک دم رنجیدہ ہو گئیں "تاجی! جلدی آؤ۔" گیلری میں نکل کر انہوں نے پھر آواز دی۔

وُہ بستر پر لیٹے لیٹے سوچنے لگی۔ دُھوپ چھاؤں جیسی زندگی گزارنے والی خالہ بی سے وُہ کیا کہے، کچھ دن پہلے وہ اس کی شادی پر زار و قطار رو رہی تھیں، اب اس کے ماں بننے کے تصوّر سے ہی خوشی کے مارے پھُولے نہیں سما رہیں، کتنی بے حقیقت زندگی ہے، جہاں پسند اور ناپسند دونوں پیروں تلے روند ڈالی جائیں، ہنستے ہنستے سب کچھ قبول کر لینا کتنے دل گُردے کا کام ہے۔

تاجی لیموں لے کر آئی تو بڑے دکھ سے اس کو دیکھ دیکھ کر ہنس رہی تھی۔

"لیجئے ساجدہ باجی!" اس نے لیموں کا ٹکڑا اس کے ہاتھ میں دینا چاہا، تو اسے جھرجھری سی آگئی "نہیں تاجی!"

"ذرا چاٹ لیجئے نا ساجدہ باجی! اس میں شرم کی کون سی بات ہے۔"

اس کا چہرہ تمتما رہا تھا "جب مجھے شرم نہیں آتی تو پھر ——"

"تاجی!" اس نے حیران ہو کر تاجی کی طرف دیکھا

"جب اللہ میاں نے غریبوں کو پیدا کیا تھا باجی، تو ان سے شرم و حیا چھین لی تھی، امّاں کہتی تھی غریب آدمی شرم کرے تو پیٹ کہاں سے بھرے۔" تاجی بے خیالی میں خود ہی لیموں چاٹنے لگی۔

ساجدہ کا دل پھڑکنے لگا۔ تاجی کے کوارٹر سے آتی ہوئی خون کی بُو اسے یاد آئی "ہائے یہ تو اب مر جائے گی، کیسی بُری حالت تھی اُس دن۔"

"دیکھ تاجی! جب ناظم آئیں گے تو تم میرے ساتھ چلنا۔"

"مجھے کون جانے دے گا باجی!" وہ جیسے کراہی "پھر باجی غریب کہیں رہے اس کی دنیا تو نہیں بدل جاتی۔"

"تاجی! غریب پیدا نہیں ہوتے، غریب تو بنائے جاتے ہیں، ایک دن غریبوں کی دُنیا بھی بدل جائے گی۔ ظلم جب حد پر پہنچ جاتا ہے نا، تو فنا ہو جاتا ہے۔" اس نے تاجی کو سمجھاتے سمجھاتے اچانک پُوچھا "کیا پھر، کاظم؟"

"ایسی باتیں مت کریں باجی! آپ تو مجھے مروا ہی ڈالیں گی۔" تاجی کا چہرہ خوف سے سفید پڑ گیا تھا "اب ایسی بات کبھی نہ کیجئے گا باجی!" وہ آنسو چھپاتی کمرے سے یُوں بھاگی جیسے کوئی اس کا پیچھا کر رہا ہو۔

"اوہ تم سجّو!" سلیمہ سلیپر گھسیٹتی کمرے میں آ کر اس کے سرہانے کھڑی ہو گئی۔ ساجدہ اُٹھ کر اس سے لپٹ گئی۔

"آپ، سلیمہ باجی! بس دیکھ لی آپ کی محبّت، میں سمجھتی تھی کہ آپ کو میرے بغیر چین نہیں پڑے گا، مگر آپ تو ——— ناظم کی گرفتاری کے بعد میں صرف آپ کا انتظار کرتی رہی تھی۔"

"ناظم بھائی۔" سلیمہ اسے بٹھا کر خود بھی پاس بیٹھ گئی۔ ناظم بھائی کی گرفتاری کوئی اچنبھے کی بات نہیں ہے، میں تو کب سے اس خبر کا انتظار کر رہی تھی سجّو! وہ جس انقلاب کا خواب دیکھ رہے ہیں حکومت اسے آسانی سے پورا نہیں ہونے دے گی، ہاں صبح سے مجھے یہ خیال ضرور آ رہا ہے کہ انہیں وہاں کہیں ———" وہ چُپ ہو گئی۔ "تاجی!" اس نے زور سے پکارا "دو پیالی چائے۔"

"میں نہیں پیوں گی۔" وہ سلیمہ کو حیرت سے دیکھ رہی تھی۔ پانچ مہینے میں وہ کتنی بدل گئی ہے، اس کے شرمندہ رہنے والے چہرے پر ایسا سپاٹ پن چھا گیا تھا جیسے سمجھنے کے لیے کچھ بھی نہ رہا ہو۔

"تم کو ناظم بھائی نے بتایا ہو گا کہ میں نے ملازمت کر لی ہے، مصروفیت میں بڑا اچھا وقت گزرتا ہے، میوزک کی کلاس بھی لے رکھی ہے اور بیڈمنٹن بھی روز کھیلتی ہوں، گھر آتی ہوں تو دنیا جہاں کا ہوش نہیں ہوتا، میں تو سمجھتی تھی کہ میرے گلے میں سُر نام کی کوئی چیز نہیں ہے مگر یار اچھا خاصا گلا پایا ہے۔" وہ زور سے ہنسی۔

"میں آپ سے یہ کتھا سُننے نہیں آئی۔" ساجدہ اس کی باتوں سے چڑ گئی تھی "میں تو آپ سے صرف یہ پوچھنا چاہتی ہوں کہ آپ مجھ سے جو محبّت فرماتی تھیں اسے

کہاں پھینک آئیں، ایک بار بھی پلٹ کر نہیں پُوچھا، ذرا ہمدردی کرنے ہی آجاتیں"۔

"محبّت، ہمدردی، غم واندوہ۔" وُہ ایک دم سنجیدہ ہوگئی" یہ اور اس قسم کے سارے لفظ مجھے بے حقیقت نظر آتے ہیں ساجدہ بی بی! دوسری باتیں کرو۔"

"معلوم ہوتا ہے سلیمہ باجی! آپ جاگیرداروں کی صحبت میں رہنے لگی ہیں۔"

سلیمہ نے شاید اس کی یہ بات بھی بے حقیقت جانی تھی۔ تاجی چائے لائی تو وہ بستر پر پلتھی مار کر مزے مزے چائے کے گھونٹ پینے لگی۔ ساجدہ کو ایسا محسوس ہُوا کہ اس وقت وہ یہاں ذرا دیر بھی نہیں بیٹھ سکتی۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ اس کی وجہ سے کوئی تلخی پیدا ہو اس لیے وہ امّاں بی کے کمرے میں گئی تو وہ نماز پڑھ رہی تھیں، پھر بھی وہ خاموشی سے اندر داخل ہُوئی اور ان کے پلنگ پر پاؤں لٹکا کر بیٹھ گئی۔ وُہ سوچ رہی تھی سلیمہ نے اسے روکا بھی نہیں، محبّت سے انکار کرنے کے بعد انسان کی کیسی صُورت نکل آتی ہے؛ کہتے ہیں کہ انسان کا چہرہ دنیا کی حسین ترین چیز ہے، ایسی غلط باتیں کس طرح شہرت پا جاتی ہیں، دنیا کی سب سے خوبصورت چیز محبّت کے جذبات ہیں، حُسن کے معیار تو ہر جگہ مختلف ہوتے ہیں مگر محبّت کا معیار ایک ہے اور وہی عالمگیر ہے، محبّت کے نام پہ ہوس یا لُوٹ مار کر کے بھی محبّت کو کون مجروح کر سکتا ہے!

نماز کے بعد امّاں بی اس سے اِدھر اُدھر کی باتیں کرنے لگیں، مغرب سے پہلے کاظم آگیا، اس نے ساجدہ کو دیکھا تو فوراً سلام کیا۔

"اچھے ہو کاظم! موٹے ہو رہے ہو، کہیں اور دیکھتی تو ذرا دیر کو پہچان بھی نہ پاتی۔"

"اچھا!" وہ ہنس دیا "آپ نے ملاقات کے لیے درخواست دے دی ہے؟"

"ہاں۔"

"ناظم بھائی نے اچھا نہیں کیا، بہرحال میں نے حکومت کو یقین دلا دیا ہے کہ میرا اپنے بھائی کے خیالات سے دُور کا بھی واسطہ نہیں ہے۔ آپ یہاں آرام سے رہیے، آپ کو کسی بات کی فکر نہیں کرنی چاہیئے۔"

ساجدہ نے کوئی جواب نہ دیا، کاظم چند منٹ ٹھہر کر اپنے کمرے میں چلا گیا۔

اُونچے اونچے درختوں اور قلعے کی بلند دیواروں کو دیکھتی طویل راستہ طے کرکے وُہ چوکیدار کے ساتھ سیڑھیوں پر بیٹھ گئی۔ اس کی سانس پُھول رہی تھی اور جی متلا رہا تھا، وہ وقت سے پہلے آ گئی تھی۔

"آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے نا بی بی جی؟" چوکیدار نے پُوچھا "آپ کا چہرہ پیلا ہو رہا ہے، آپ زیادہ پریشان نہ ہوں، اللہ رحم کرنے والا ہے۔"

وہ جواب میں صرف مُسکرا دی۔ وہ سوچ رہی تھی شاہوں کے شوقِ تعمیر کی یہ نشانیاں اب عجائب میں گنی جاتی ہیں، سیّاح دُور دُور سے انھیں دیکھنے آتے ہیں، وہ فنِ تعمیر کی داد دیتے ہیں اور پتھّروں پر گزرے ہوئے زمانے کی تہذیب کی تحریر پڑھنے کی کوشش کرتے ہیں مگر کیا خبر، قلعے کی در و دیوار سے ٹپکتی ہوئی ہیبت دیکھ کر وُہ بھی میری طرح سوچتے ہوں کہ یہاں پہلے بھی تو قیدی رہا کرتے تھے۔ جُھمکوں، ٹیکوں اور چھپکوں سے سجے ہوئے چہرے، ہاروں سے لدے ہُوئے سینے، بازوبند سے بندھی ہوئیں مرمریں باہنیں ——— غلاموں کی اطاعت، مشیروں کے مشورے، جسم دل اور دماغ ——— محبّت اور نفرت کے جذبے، سب قید تھے۔ قلعے کی فصیل کے اندر رقص و سرو

کی محفلیں جمتی تھیں اور عقوبت خانوں میں نافرمان داغے جاتے تھے ـــــ اور اب صدیاں گزرنے کے بعد بھی وہی سب کچھ ہے، جشن، قصیدے اور عقوبت خانے ـــــ باادب، باملاحظہ ـــــ اس کے کانوں میں گونج سی ہوئی، مگر سپاہی تو کہہ رہا تھا "ملاقات کے لیے چلو"۔ اس کے آگے ایک عورت چھوٹے سے بچّے کی انگلی پکڑے سیڑھیاں اُتر رہی تھی۔ اس کی آنکھوں میں آنسو تھے اور چہرہ تمتمایا ہوا تھا۔

وہ سپاہی کے پیچھے ایک پُرانے کمرے میں داخل ہوئی، جہاں سیلن کی بُو پھیلی ہوئی تھی، ایک طرف پولیس کا کوئی افسر کرسی پر بیٹھا تھا۔

"تشریف رکھیے"۔ اس نے ایک کرسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا اور سپاہی کو حکم دیا کہ ناظم صاحب کو لے آؤ۔

ساجدہ کی نظریں دروازے پر لگی ہوئی تھیں۔ چند منٹ بعد ناظم کمرے میں داخل ہُوا۔ وہ آہستہ آہستہ چل رہا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس کی ٹانگوں میں سخت تکلیف ہے، ساجدہ کو دیکھ کر وہ مسکرایا اور ساتھ والی کرسی پر بیٹھ گیا۔

"سب کیسے ہیں؟" وہ ساجدہ کو پیار سے دیکھ کر مسلسل مسکرا رہا تھا، مگر ساجدہ کو اس کے چہرے پر اُبھرے ہوئے نیل دکھائی دے گئے تھے۔ اُسے اپنا کلیجہ کٹتا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔

"سب اچھے ہیں، تمہیں یاد کرتے ہیں، میں گھر چلی گئی ہوں، آپ میری ذرا فکر نہ کریں میں بی ٹی کے امتحان کی تیاری میں مگن ہوں۔"

"بہت اچھی بات ہے، تمہاری صحت کچھ کچھ ـــــ" ناظم بات پوری

نہ کر سکا۔

ساجدہ کو ایک دم یاد آیا کہ ناظم کو وہ خبر بھی تو سنانی ہے، یہاں کوئی خیال تو ایسا بھی ہو جو اس کی ہمّت بڑھا سکے، اس میں جینے کی امنگ قائم رکھے، وہ ناظم کے کان کی طرف جُھکی۔

"یہاں سرگوشی کی اجازت نہیں ہے۔" پولیس افسر نے کہا

"بہت اچھّا، مجھے صرف یہ بتانا ہے کہ میں کچھ عرصے کے بعد ماں بننے والی ہوں۔"

ساجدہ نے بڑے وقار سے پولیس افسر کی طرف دیکھا۔

"اوہ! —— ساجدہ ——" ناظم نے مارے خوشی کے کرسی سے اُٹھنا چاہا مگر ایک ہلکی سی کراہ اس کے لبوں پر آکر ٹوٹ گئی "بھئی! یہاں تو خوشی کے اظہار کے لیے بھی سوچنا پڑتا ہے، خیر تم اپنی صحت کا خیال رکھنا، مجھے پندرہ دن کے بعد ایک خط لکھنے کی اجازت ہے میں تم کو خط لکھوں گا۔" اس نے بڑے پیار سے کہا۔ ساجدہ کو ایسا محسوس ہوا جیسے ناظم کی آنکھوں سے سفید رُوئی کے نرم نرم گالے اُڑ رہے ہوں۔

ساجدہ نظریں جھکا کر بیٹھ گئی جیسے اب کہنے کے لیے کوئی بات نہیں رہ گئی۔ ناظم بھی چُپ تھا، تمام اَن کہی باتیں ہونٹوں کی کپکپی بنی ہوئی تھیں۔

"ملاقات کا وقت ختم ہو گیا ہے۔" پولیس افسر نے کہا

وہ اٹھ کھڑی ہوئی "خدا حافظ!" اس نے ناظم کے پیلے چہرے پر ایک نظر ڈالی اور مُڑ گئی۔

"خدا حافظ! اپنا خیال رکھنا اور سب کو سلام کہنا۔"

جب وہ چوکیدار کے ساتھ گھر واپس جا رہی تھی تو اس کا جی چاہ رہا تھا کہ اپنے شوہر کو دی جانے والی اذیتوں پر کلیجہ پھاڑ کر روئے، جنھیں اس نے اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا اور اپنے جسم میں محسوس کیا تھا مگر وہ ایک آنسو بھی نہ بہا سکی۔

کتنا عرصہ ہو گیا کہ ساری کیفیتیں اس کے دل پر گزر جاتیں مگر وہ رو نہ پاتی۔

ملک میں جیسے ایک بم پھٹا۔ لیاقت علی خاں کو تقریر کے دوران میں گولی ماردی گئی۔ گولی چلانے والے کو بھی گولی ماردی گئی۔ قانون کے دونوں ہاتھ خالی رہ گئے۔ لوگوں کی سوالیہ نظروں کو صحیح جواب دینے والا کوئی نہ تھا۔

"یہ گولیاں کہاں سے آرہی ہیں!" مالک آج بالکل ہوش میں تھے، خالہ بی کے آنسوؤں نے انھیں ہر وقت کے نشے سے روک دیا تھا۔

مجھ سے کچھ نہ پُوچھیے مالک! میرا دماغ بالکل سوچنے سمجھنے کے لائق نہیں رہا۔ میرے ذہن میں آج کل صرف وہ اذیتیں ہیں جو قلعے میں ناظم اور دوسرے سیاسی قیدیوں کو پہنچائی جارہی ہیں، کاظم ہی آپ کو بتا سکے گا کہ یہ سب کیا ہُوا ہے، میری دنیا تو یہ گھر ہے اور بس!

رات کو کاظم آیا تو مالک اسے دیکھتے ہی کھڑے ہو گئے۔

"یہ کیا ہوا ہے بیٹے؟"

"یہ دوسرے ملکوں کی کارستانیاں ہیں۔" اس نے بے حد قابلانہ انداز سے کہا

"تمھاری فکر اب کچھ کچھ بلند ہوتی جارہی ہے۔" ساجدہ نے آہستہ سے کہا

کاظم نے شاید اس کی بات سُنی نہیں تھی، اُسے بھوک ستا رہی تھی "خالہ بی! کھانا کھلوائیے، میں نے دوپہر کو بھی کچھ نہیں کھایا"۔

"جانے ہمارے پاکستان کو کس کی نظر لگ گئی ہے!" خالہ بی نے اُٹھتے ہوئے کہا

"کاظم جیسوں کی ——" ساجدہ نے یہ بات اتنے آہستہ سے کہی کہ صرف اس کا کلیجہ ٹھنڈا ہو گیا اور بس! پھر وہ اُٹھ کر کمرے میں چلی گئی، وہی پرانا کمرہ، جس کے دروازے وہ اب رات کو بھی بند نہ کرتی تھی۔

وُہ جا رہی تھی تو خالہ بی اُسے آواز دے رہی تھیں "ساجدہ! کھانا تو کھا لو"۔

"مجھے بھُوک نہیں ہے خالہ بی!"

وُہ اپنے بستر پر لیٹ گئی۔ سلیمہ کی کہیں دعوت تھی۔ اس لیے وُہ ابھی تک نہیں آئی تھی۔ سلیمہ کا رویہ اُسے ہر وقت پریشان رکھتا تھا، جب وہ ناظم سے مل کر آتی تھی تو سلیمہ سرسری طور پر اس کے لیے پُوچھتی، وُہ بھی جواب میں بس اتنا ہی بتاتی کہ وُہ ٹھیک ٹھاک ہے اور تم کو پُوچھتا ہے۔ سلیمہ کا رویّہ اور گھر سے بے اعتنائی خالہ بی کا کلیجہ نوچ رہی تھی۔ اس سے جب بھی وہ بات کرتیں تو ان کے لہجے میں انتہائی لجاجت ہوتی مگر ان کی بات کا جواب دینے کی بجائے سلیمہ کو بہت سے غیر ضروری کام یاد آ جاتے وُہ بستر کی چادریں جھاڑنے لگتی، کُرسیاں اِدھر اُدھر رکھنے لگتی اور کبھی کبھار ہُوں ہاں میں جواب دے دیتی۔

لیٹے لیٹے اسے خیال آیا کہ دو تین دن سے تاجی کو نہیں دیکھا، وہ شام ڈھلے اس کے پاس آ کر رات کا ایک حصّہ کٹوا جاتی تھی لیکن اب تو صبح کو بیچاری خالہ بی

ہانپ ہانپ کر مہترانی کا ہاتھ بٹاتی تھیں۔ انہوں نے تاجی کا کام خود سنبھال لیا تھا۔

تاجی کے خیال کے ساتھ ہی وہ اُٹھ کھڑی ہوئی اور اس کے کوارٹر کی طرف چل دی۔

تاجی اپنے بستر پر لیٹی مچھروں سے جنگ کر رہی تھی اس کے سرہانے کھونٹی سے لٹکی ہوئی لالٹین کی بتّی اتنی نیچی تھی کہ ہر چیز مدھم ہو گئی تھی، تاجی کا چہرہ سیاہ نظر آ رہا تھا۔

"تاجی!" اس نے آہستہ سے پکارا "کیسی ہو؟" جواب کا انتظار کیے بغیر اس نے لالٹین کی بتّی اونچی کر دی تو اس نے دیکھا کہ تاجی کی روشن آنکھوں کی بتّی نیچی ہو گئی تھی۔

"آپ یہاں کہاں ساجدہ باجی؟ یہاں تو کوئی ٹوٹی ہوئی کرسی بھی نہیں ہے، کہاں بیٹھئے گا آپ؟"

"میں بیٹھ جاؤں گی، تم میری فکر نہ کرو، تم کب سے بیمار ہو؟"

"باجی! وقت کیا ہوا ہے؟"

"آٹھ بجے ہوں گے تاجی!"

"آٹھ ——" اس نے لمبی سانس بھری "اب آپ جائیں باجی! چوکیدار کسی کو بلانے گیا ہے، کیا خالہ بی نے آپ کو ہدایت نہیں کی کہ سب سو جائیں۔ ان کے سر میں درد ہے۔"

"کون آنے والا ہے، چوکیدار کسے بلانے گیا ہے؟" ساجدہ کچھ کچھ

سمجھتے ہُوئے بھی پُوچھ رہی تھی۔

"میں اُسے دیکھتے ہی کانپنے لگتی ہوں باجی! ایک دن ——"

"تم گھبراؤ نہیں، میں ابھی خالہ بی سے بات کرتی ہُوں"۔ ساجدہ نے اس کی تپتی ہوئی پیشانی پر ہاتھ رکھ دیا۔

تاجی جیسے بلبلا کر اُٹھ بیٹھی "آپ کچھ نہیں کہیں گی خالہ بی سے، وہ مجھے مار ڈالیں گے"۔ اُس کی آواز مدھم پڑ گئی "قصور میرا ہے باجی! پہلی بار جب کاظم نے کہا تھا کہ وہ مجھ سے محبت کرتا ہے، تو میرا تن من سب پگھل گیا تھا۔ یہ محبت کیا چیز ہوتی ہے باجی؟ خالہ بی نے مجھے کتنی گالیاں دی تھیں کہ میں ان کے معصوم بیٹے کو بھڑکا رہی ہُوں مگر —— اور اب ان کا معصوم بیٹا، ان کا افسر راجہ، جب چاہتا ہے مجھے رشوت کے مال کی طرح کھا لیتا ہے اور خالہ بی ——"

پھاٹک کھُلنے کی آواز آئی تو تاجی تھر تھر کانپنے لگی "آپ جائیں باجی! جلدی سے جائیں، میں ہاتھ جوڑتی ہُوں، خدا کے لیے جائیں"۔ وہ رونے لگی۔

ساجدہ تاجی سے کچھ نہ کہہ سکی۔ جب وہ گیلری میں داخل ہوئی تو خالہ بی سے مڈھ بھیڑ ہو گئی۔

"تم کہاں تھیں؟" انہوں نے ساجدہ کو غور سے دیکھا۔

"تاجی کو دیکھنے گئی تھی"۔ اس کے لہجے میں سختی تھی۔

"رات کو کوارٹروں میں جاتی ہو کہیں اونچا نیچا پاؤں پڑ گیا تو لینے کے دینے پڑ جائیں گے"۔ خالہ بی نرم پڑ گئی تھیں "اللہ سب خیریت رکھے، خوشیوں کا مُنہ دکھائے"۔

ساجدہ اپنے کمرے میں بستر پہ گرسی پڑی، وہ عجیب سا کرب محسوس کر رہی تھی "جانے وہ جلّاد عورت، جسے دیکھ کر تاجی کانپنے لگتی ہے، اس کے ساتھ کیا سلوک کر رہی ہو گی؛ تاجی پر کیا گزر رہی ہو گی! اور وہ کاظم، خالہ بی کی محبّت کی آڑ میں کس سکون سے سو رہا ہو گا! کوئی اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا، شاید ہمیشہ سے یہی ہوتا آیا ہے، شاید کمزور ہمیشہ طاقتوروں کے لیے عیاشی کے اڈّے بنے رہے ہیں!"

اس کا جی چاہا کہ کاظم کو جا کر جھنجھوڑے اور اس سے کہے کہ نوکروں کے ایک کوارٹر میں تمہاری اولاد کا گلا گھونٹا جا رہا ہے، پھر اسے اپنے اس احمقانہ خیال پر غصّہ آنے لگا۔ انھیں اولاد کون کہتا ہے؟ یہ تو وہ معصوم رُوحیں ہوتی ہیں جنہیں دنیا میں آنے کی اجازت کب ملتی ہے؟ اور اگر دنیا میں آ جائیں تو ذلّت ہمیشہ ان کا سایہ بنی رہتی ہے۔

سوچتے سوچتے وہ اتنی تھک گئی تھی کہ بے چین، ویران اور اداس نیند نے اسے ذرا دیر کو غافل کر دیا۔

ابھی اندھیرا تھا، کہیں دُور سے موذّن کی آواز آ رہی تھی، اس کی آنکھ کھل گئی، اسے یُوں لگ رہا تھا جیسے وُہ سوئی ہی نہیں تھی، اس کے سر میں سخت دھمک ہو رہی تھی، وہ دونوں ہاتھوں سے کنپٹیاں دبانے لگی۔

"سو رہی ہو ساجدہ!" خالہ بی وحشت زدہ سی کمرے میں داخل ہوئیں اور روشنی کر دی۔

"نہیں۔" وُہ اٹھ کر بیٹھ گئی۔

"نانا جی کی طبیعت بہت خراب ہے، کیا کروں ساجدہ! میں سخت پریشان ہوں اسے کچھ ہو گیا تو ——"

"آپ نے جس جلاد کو بلوایا تھا کیا وہ کچھ نہیں کر سکی۔"

"تم اسے ہسپتال لے جاؤ۔" خالہ بی گھگھیا رہی تھیں "چوکیدار کو اس کا شوہر لکھوا دینا۔"

"نہیں خالہ بی! یہ کام کاظم کا ہے۔" ساجدہ کو غصہ آ گیا۔

"اوہ ساجدہ! تم کیسی باتیں کر رہی ہو، وہ اس ذلیل لڑکی کو لے کر ہسپتال جائے تم نہیں جانتیں ان باہر پھرنے والی نیچ لڑکیوں کو، انھیں لاکھ چار دیواری میں قید رکھو، وہ اپنی عادتوں سے باز نہیں آتیں، آخر مرد ذات کیا کرے جب کوئی ہر دم ناز نخرے دکھاتا رہے۔"

ساجدہ کا جی چاہا کہ اپنا سر پیٹ لے، خالہ بی کا منہ نوچ لے، کاظم کا گلا گھونٹ دے۔

"میں نہیں جاؤں گی، کاظم جائے گا کاظم! یا پھر آپ جائیں گی جو کاظم کی عزت بچانے کے لیے ایک غریب لڑکی کی جان سے کھیل رہی ہیں۔" وہ زور سے بولی تو خالہ بی نے ایک دم اس کے آگے ہاتھ جوڑ دیے۔

"اتنی زور سے نہ بولو، کہیں مالک نہ سن لیں، وہ شراب ضرور پیتے ہیں مگر ان کا دامن ہمیشہ پاک رہا ہے، وہ کاظم کو مار ڈالیں گے یا خود مر جائیں گے اور پھر تمہاری اماں بی —— میری گود میں پلا ہوا کاظم ——" وہ رو پڑیں۔ وہ کتنی مدت سے ایک ایک آنسو کو ترس رہی تھی مگر کسی کے آنسو دیکھنے

کی تاب نہ رکھتی تھی۔ اس نے سوچا اگر تاجی مرگئی تو ——— وہ ساری زندگی خود کو مجرم محسوس کرے گی۔

"پھر مَیں کیا کروں؟"

"تم ایسا کرو میری جان ———" خالہ بی روتے ہوئے کہہ رہی تھیں "ڈرائیور موجود ہے تم مالی کو اور تاجی کو ساتھ بٹھا کر ہسپتال چلی جاؤ۔"

اس نے خالہ بی کی بات کا کوئی جواب نہ دیا، بالوں پر اُلٹی سیدھی کنگھی کر کے وُہ تیزی سے تاجی کے کوارٹر کی طرف چل دی، خالہ بی اس کے پیچھے پیچھے جیسے دوڑ رہی تھیں، ان کی سانسوں کی آواز وہ اچھی طرح سُن رہی تھی، تاجی نڈھال پڑی تھی، لالٹین کی مدھم پیلی روشنی جیسے اس کے چہرے پر پھیل گئی تھی۔

"تاجی!" ساجدہ نے پکارا مگر اس نے آنکھ نہ کھولی۔

"ارے بی بی جی! آپ بھی کیا ہسپتال کی بات کر رہی ہیں، ہزاروں کیس کرتی ہُوں، صبح تک لوٹ پوٹ کر ٹھیک ہو جائے گی، ایک ذرا گھر جانے دیجئے چار خوراک دوا کی دُوں گی خُون بند ہو جائے گا۔"

"اور اگر یہ مرگئی تو تم گھر نہیں تھانے جاؤ گی"۔ ساجدہ نے دائی کو خُونی نظروں سے دیکھا "اٹھواؤ کھاٹ۔"

دائی نے سہم کر ساجدہ کو دیکھا اور پھر مالی کے ساتھ کھاٹ پکڑ کر کار تک لے گئی۔

سنّاٹے میں شبخون مارنے والا آرام سے سو رہا تھا اور ساجدہ اپریشن تھیٹر کے باہر ٹہل ٹہل کر تاجی کی زندگی کی دُعائیں مانگ رہی تھی۔

دو تین دن جنرل وارڈ کے بستر پہ آرام کرنے کے بعد نانی گھر آ گئی تھی، اسے دیکھ کر خزاں کی ساری پیلاہٹ ساجدہ کے ذہن میں رچ جاتی، وہ اب اتنی چپ اور کھوئی کھوئی سی تھی جیسے اس کے بولنے اور سوچنے سمجھنے کی صلاحیت سے بھی خون کا آخری قطرہ نچوڑ لیا گیا ہو۔

ناظم کا خط آیا تھا، اس نے لکھا تھا کہ میں آج کل وہ کتابیں پڑھتا رہتا ہوں، جو تم مجھے دے گئی تھیں، وقت گزاری کے لیے یہ کتابیں بھی کتنی قیمتی معلوم ہوتی ہیں، بہتر حالات میں اگر کوئی کہتا کہ انھیں پڑھ لو اور انعام لے لو تو میں شاید ہی پڑھتا، یہ عشق و محبّت کی داستانیں، جن میں عورت کی طرح طرح سے تحقیر کی جاتی ہے۔ پڑھنے کی چیز نہیں ہیں مگر کیا کیا جائے، یہ بھی کلاسکس میں شامل ہیں۔ امید ہے وہ کتابیں تمہیں واپس مل گئی ہوں گی جن سے میں اپنے علم کی پیاس بجھانے کا اہل نہیں تھا یا وہ میرے پڑھنے کے لائق نہیں تھیں۔ فرصت کے اوقات میں ایک ننھّے مُنّے یا ایک ننھّی منّی سی جان کے تصوّر میں کھو جاتا ہُوں جو یا تو تمہاری طرح ہو گی یا پھر میرے جیسا ہو گا۔ اپنی صحت اور میری امانت کا خیال رکھنا، یہ لکھنا تو بے کار ہے کہ میں تم کو کس قدر یاد کرتا ہُوں۔ سب کو سلام

وہ ہر پندرھویں دن ملاقات کے لیے جاتی تو ناظم اسے پہلے سے کمزور لگتا۔ وہ اپنی صحت کھو رہا تھا۔ وہ بہت دُبلا اور پیلا ہو گیا تھا۔

گھر واپس آ کر وہ گھنٹوں مُنہ لپیٹے پڑی رہتی۔ امّاں بی، خالہ بی اور مالک سب کرید کرید کر ناظم کی خیریت پُوچھتے، وہ کیسا ہے؟ وہ کیا باتیں کرتا ہے؟

اُسے کھانے کو ٹھیک سے ملتا ہے؟ وہ سب کو ایک ہی جواب دیتی وہ بالکل اچھّے ہیں، وہاں کوئی خاص بات تو ہو نہیں سکتی سب کی خیریت پُوچھتے ہیں۔

رات کو تاجی اپنے کاموں سے فرصت پاکر اس کے پاس آکر بیٹھ جاتی، اور بڑے چاؤ سے اُس کے ہونے والے بچّے کی باتیں کرتی رہتی۔

"آپ اس کے لیے چھوٹا سا نرم تکیہ بنائیے گا ساجدہ باجی! لحاف، گدّا سب ریشمی ہونا چاہئیں اور ہاں اس کے لیے پیارے پیارے لبسوں والے کپڑے بنائیے گا، ہائے کیسا پیارا لگے گا! جانے کس پر پڑا ہوگا، آپ جیسا ہوگا یا ناظم میاں جیسا ——!

ساجدہ اس کی باتیں سُن سُن کر ہنستی رہتی۔ مگر آج رات جب وُہ کام ختم کر کے اُس کے کمرے میں آئی تو صاف سے رومال میں کوئی چیز لپیٹ کر سینے سے لگائی ہوئی تھی "یہ ساجدہ باجی! میں نے سی ہے، اپنے ہاتھوں سے، مالی سے کپڑا منگایا تھا، اتنا اچھّا تو نہیں ہے، پھر بھی ——"

ساجدہ نے اس کے ہاتھ سے رومال میں لپٹی ہُوئی چیز اس طرح جھپٹ لی جیسے اُسے دیکھنے کو مری جا رہی ہے۔

نیلی ساٹن کی ننھی سی قمیص جو سفید دھاگے سے سِلی ہوئی تھی اور کالر سے لے کر دامن تک قمیص نام کی چیز کا منہ چڑا رہی تھی۔

"ہائے تاجی! کتنی پیاری قمیص ہے، سچ تم نے سی ہے، مجھے تو یقین نہیں آرہا۔" اس نے جلدی سے قمیص کو بکس میں رکھ دیا۔ مارے خوشی کے تاجی کی آنکھیں چمکنے لگیں۔

"ایک بات بتائیں باجی!" وہ ایک دم رنجیدہ سی ہو گئی "کیا آپ اُسے میری گود میں دیا کریں گی؟"

"کیوں، کیوں نہیں دُوں گی!"

تاجی نے ایک دم دونوں ہاتھوں سے اپنا مُنہ چھپا لیا اور گھُٹ گھُٹ کر روتی ہُوئی بھاگ گئی۔

ساجدہ کے ذہن کو جھٹکا سا لگا، جیسے زلزلہ آ گیا ہو، جسم و جان کے در و دیوار کانپ کانپ کر گر رہے ہوں اور کوئی مدد کرنے والا بھی موجود نہ ہو، ذرا دیر بعد جب وہ اپنے پر قابو پانے میں کامیاب ہوئی تو اس نے بڑی نحیف سی آواز میں پکارا: "تاجی!"

سات دن تک خالہ بی اس کے ساتھ ہسپتال میں رہی تھیں۔ ساجدہ کے ننھے مُنّے گول مٹول لڑکے کو دیکھ دیکھ کر وہ خوشی سے نڈھال ہوتی رہتیں۔ گھر آئی تو یہاں بھی عجیب سی خوشی کی لہر دوڑ رہی تھی، ماموں تو تُتلا کر بچّے سے باتیں کرتے "میں تمہارا دادا ہوں دادا، پہچانتے ہو مجھے!"

امّاں بی جب دیکھتیں کہ گھر میں سب مصروف ہیں تو اُس کے کمرے میں آجاتیں، بچّے کو پیار کرتیں اور ہاتھ پھیلا کر ناظم کی واپسی کی دُعا کرتیں۔ سلیمہ ویسے تو رات سے پہلے گھر نہ آتی اور آتے ہی اپنا کمرہ بند کر لیتی مگر اب وُہ چند منٹ کے لیے بچّے کو دیکھنے آجاتی۔ اور تاجی جب بڑے چاؤ سے بچّے کو گود میں لینے آتی تو خالہ بی اُس کے گندے پوتڑے اُس کے ہاتھ میں تھما دیتیں، وہ چپ چاپ چلی جاتی۔

ساجدہ جب تنہا ہوتی تو ناظم اُسے بے تحاشہ یاد آنے لگتا۔ ناظم جو اس کے بچّے کا باپ تھا اور جس نے خط میں لکھا تھا کہ میری آنکھوں نے میرے بچّے کا رُوپ دھار لیا ہے، جب میں آؤں گا تو تمہارے مشورے سے اس کا نام رکھوں گا، زنداں میں بہت سے اچھّے اچھّے نام یاد آرہے ہیں، ایسے نام جو مجھے بہت

پسند ہیں، بعض دفعہ ایسا بھی دیکھنے میں آتا ہے کہ نام شخصیت کے آئینہ دار بن جاتے ہیں۔

آج دوپہر میں جب وُہ اکیلی تھی تو جانے کیوں دیر تک ننھّے کو غور سے دیکھتی رہی اور سوچتی رہی کہ اس کی شکل کس پر پڑی ہے، پھر اُسے ایک دم احساس ہوا کہ بچّے کی پیشانی صلاح الدین جیسی ہے۔ اس کے بعد وُہ جوں جوں دیکھتی رہی ننھّے کے سارے نقوش اُبھر اُبھر کر صلاح الدین سے ملنے لگے۔ اس نے بچّے کو زور سے سینے سے لگا لیا، دروازے پر قدموں کی چاپ ہُوئی تو اس نے مڑ کر دیکھا، کاظم دروازے پر جھجکا کھڑا تھا۔

"آجاؤ کاظم! تم جھجک کر کیوں کھڑے ہو گئے؟ آجاؤ، میں تو تلخ یادوں سے بھی کوئی اچھا سا پہلو تلاش کر لیتی ہُوں، ذرا سوچو تو، اگر تم مجھے بھی تاجی نہ سمجھتے تو میں شاید تمھاری بھاوج کبھی نہ بنتی، یہ ننھّا مجھے کبھی نہ ملتا، میرے دل کے گھاؤ پر جب یہ ننھّا سا ہاتھ چھُو جاتا ہے تو ——" وُہ چپ ہو گئی۔

کاظم سر جھکائے بچّے کے پاس آیا تو جیسے سب بھُول گیا "اے مسٹر!" اس نے انگلی سے بچّے کا ہاتھ پکڑ کر ہلایا "ارے بھابی! یہ تو بالکل بھائی میاں جیسا ہے۔"

ساجدہ کھسیانی سی ہو کر ہنس پڑی، ذرا دیر پہلے وہ کیا سوچ رہی تھی، بچّے تو کئی رُوپ بدلتے ہیں، پھر کہیں ان کا ناک نقشہ نکلتا ہے "ہاں بالکل تمہارے بھائی میاں کی طرح ہے۔"

"اے ننھّے میاں! تم ہو تو ویسے ہی مگر بڑے ہو کر ان کی طرح نہ بننا، میری

طرح بننا، خوش رہو گے! بس بھابی! میں بھی اب شادی کروں گا، ننھّے کو دیکھ کر جی چاہ رہا ہے کہ میرا بھی بیٹا ہو۔" اس نے زور سے قہقہہ لگایا اور ننھّے کو گود میں اٹھا کر پیار کرنے لگا۔

"وہ بچے جنہیں تاریکی میں موت کی نیند سُلا دیا گیا ہے، کیا پتہ دونوں بیٹے ہی ہوں۔" ساجدہ نے اپنا تیر نشانے پر مارا تھا، مگر وہ بڑی ڈھٹائی سے ہنسنے لگا۔

"اخلاقیات کے تصوّر نے سلیمہ باجی کو کسی کام کا نہیں رکھا۔ آپ اس چکر میں نہ پڑیں، تاجی سے میں فائدہ نہ اٹھاتا تو کوئی اور اٹھاتا! وُہ دنیا میں اسی لیے پیدا ہوئی ہے، مزے سے کھاتی پیتی ہے، ہنستی کھیلتی ہے، اور اسے کیا چاہیے! اس کے چھوٹے سے ذہن میں کسی رشتے ناطے کا خیال تک نہ آتا ہوگا، اور آپ ان بیٹوں کی موت کا حساب لگانے بیٹھ گئیں جو کُوڑے کے ڈھیروں پر اور ندی نالوں میں پڑے سڑتے ہیں، کوئی ان کی موت کا حساب نہیں لگاتا۔"

شاید اُسے غصّہ آگیا تھا۔ ننھّے کو ساجدہ کے سامنے لٹا کر وہ تیزی سے کمرے سے نکل گیا۔

"جواب تو سُنتے جاؤ میرے بھیا!" اس نے زور سے کہا۔ مگر کاظم تو بہت دُور نکل گیا تھا۔ "کمینے!"

کاظم کو کمینہ کہہ کر اُسے ذرا سا سکون ملا۔

ناظم رہا ہو کر آج گھر آیا تھا۔ وہ اتنا کمزور ہو گیا تھا کہ پہچانا نہیں جاتا تھا۔ سلیمہ حسبِ معمول کالج سے کسی سہیلی کے ہاں چلی گئی تھی، خالہ بی، مالک اور تاجی ساجدہ کے کمرے میں جمع تھے۔ تھوڑی دیر بعد کاظم بھی آ گیا۔ دونوں بھائی رسمی طور پر ملے، دونوں کی آنکھیں رشتوں ناطوں کی محبّت سے خالی تھیں۔ ناظم اپنے بچّے کو گود میں لیے مسلسل چوم رہا تھا، وہ صرف چند منٹ کھڑا رہ سکا۔ اس کی ٹانگیں کانپنے لگیں، وہ گھبرا کر بیٹھ گیا۔

"آپ بہت کمزور ہو گئے ہیں بھائی میاں! وہ تو کہئے میں نے بالا بالا کوشش کر کے آپ کو رہا کرا لیا۔"

"شکریہ! اتنی سی عمر میں تم ڈپٹی کمشنر ہو گئے۔ اس شہر میں رہتے ہو، کیا تم اتنا بھی نہ کرتے، ویسے تمہاری اطلاع کے لیے بتا دوں کہ میری قید کی میعاد پوری ہو گئی تھی۔"

"میعاد کی بات نہ کیجئے بھائی میاں! آپ کو اچھی طرح معلوم ہے کہ میعاد بڑھتی رہتی ہے۔"

"یہ خوش ہونے کا وقت ہے، فضول باتوں کا نہیں۔" خالہ بی نے شاید

پہلی بار کاظم کو ہلکا سا جھڑکا تو اس نے ناظم کی طرف یُوں گھُور کے دیکھا جیسے احسان فراموشی پر اسے گالی دے رہا ہو۔ مگر ناظم تو اپنے بچّے میں گُم تھا۔

"میں نے ساجدہ! تمہیں لکھا تھا ناکہ واپس آ کر بچّے کا نام رکھوں گا۔ تو سُنو، اس کا نام ہے اسد۔ لو اب اسد کو تم سنبھالو۔ میرے ہاتھ دُکھ گئے ہیں۔"

"تمہیں اس کا نام مالک سے پُوچھ کر رکھنا چاہیے تھا۔ تم نے ان سے پوچھا ہی نہیں۔"

"کوئی بات نہیں، کوئی بات نہیں۔ بچّے جب بڑے ہو جاتے ہیں تو اپنی مرضی کے مالک ہوتے ہیں اور پھر میں ——— سب بچّے تو ———" نہ جانے ناظم کیا کہنا چاہتے تھے جو کہہ نہ سکے۔

"میرے ایک عزیز دوست کا نام اسد ہے، وُہ مجھے بہت پسند ہے، باہمّت اور جیالا۔"

"کہاں ہے وہ؟" کاظم بڑی چالاک نظروں سے ناظم کو دیکھ رہا تھا۔

"وہیں، جانوروں کے باڑے میں، جہاں انسانوں کے لیے "ڈاگ سیل" بنائے گئے ہیں۔ سمجھ میں آیا کاظم میاں!"

کاظم نے ایک قہقہہ لگایا، گھڑی دیکھی اور یہ کہتے ہُوئے کمرے سے نکل گیا کہ "مجھے کلب جانا ہے۔"

ناظم نے غصّے سے کاظم کو گھورا اور پھر اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔

"آپ ناراض نہ ہوں ناظم میاں! آپ کی صحت بہت خراب ہو گئی ہے۔" تاجی نے سر پہ دوپٹہ ٹھیک کرتے ہوئے کہا اور پھر رو پڑی۔

"بس بس، سارا دکھ تمہارے جگر میں ہے، چلو اپنا کام کرو، چار دن میں میرا بیٹا ٹھیک ٹھاک ہو جائے گا۔" خالہ بی نے اسے جھڑکا۔ ذرا دیر بعد سب لوگ کمرے سے چلے گئے۔ اماں بی ذرا دیر کو آئیں اور اپنے بیٹے کو دُعائیں دے کر چلی گئیں۔

ساجدہ جیسے ایک دم گھبرا گئی، ناظم اپنے لاغر جسم کو سنبھالتا اٹھا اور اس کے پاس بیٹھ گیا۔ اس کے پاؤں میں سخت تکلیف تھی، وُہ ایک پاؤں کھینچ کر چلتا تھا، اُسے ناظم پر رحم آنے لگا، وہی رحم جو اس نے شادی کے بعد ہمیشہ اس کے لیے محسوس کیا تھا۔

ناظم نے ساجدہ کے چہرے پر اپنا ٹھنڈا چہرہ رکھ دیا "تم نے مجھے وہاں زندہ رہنے پر مجبور کیا جہاں انسان موت کی دعائیں مانگتا ہے۔" وہ بے حد جذباتی ہو رہا تھا

"اب ان باتوں کو بھول جاؤ، کل ہم اپنے گھر چلیں گے اپنے اسد کو لے کر۔" ساجدہ نے اس کا چہرہ اپنے ہاتھوں میں تھام لیا "میں ملازمت کر لوں گی اور تم کچھ عرصہ آرام کرنا۔"

"ایسی شاندار کوٹھی میں اتنے دن گزارنے کے بعد وہاں گھبراؤ گی تو نہیں، اس گھر کا تو حلیہ ہی بدل گیا ہے، پھاٹک سے داخل ہُوا تو لان دیکھ کر یُوں لگا جیسے لارنس گارڈن میں آ گیا ہُوں۔"

"مجھے تو یہاں سخت وحشت ہوتی ہے۔" پھر ساجدہ اُسے سارے قصّے سنانے لگی، تاجی کے بچّوں کی بے وقت موت، کاظم کی عزّت بچانے کے لیے خالہ بی کی پریشانی، سلیمہ کی گھر سے بیزاری، مالک کی شراب نوشی میں کمی۔ اور پھر اس نے یہ بھی بتایا کہ مالک کو یقین ہے کہ جیل سے واپسی کے بعد تمہارے خیالات بدل

جائیں گے، تم اپنے بھائی کے ساتھ تعاون کرو گے اور اس طرح یہ بھرا پُرا گھر خالی نہ ہوگا، سلیمہ بھی گھر میں دلچسپی لینے لگے گی، کیونکہ سلیمہ صرف تمہاری بات سنتی ہے، وہ تمہاری ہم خیال بھی ہے اور تم سے بہت قریب بھی۔" اس نے یہ بھی بتایا کہ تاجی اب ہمارے ساتھ جانے کو کہتی ہے۔"

ناظم تمام باتیں خاموشی سے سُنتا رہا مگر اس کے چہرے کا رنگ بار بار بدلتا، جیسے وہ سخت کرب سے گزر رہا ہے۔

"میں یہاں نہیں رہ سکتا، میں ایسے گھر میں ایک دن بھی نہیں رہ سکتا، یقین کرو ساجدہ! اس گھر کا تالا میں نے نہیں توڑا تھا، جس گھر پر تالا توڑ کر قبضہ کیا جائے وہ کسی کا نہیں ہوتا، میں اس لاوارث گھر میں کیسے رہ سکتا ہوں! ہاں کوشش کروں گا کہ تاجی کو ساتھ لے جاؤں۔"

"آپ کو مالک بلاتے ہیں ناظم میاں!" تاجی سر جُھکائے آئی اور چلی گئی۔ ناظم آہستہ آہستہ چلتا ہوا کمرے سے نکل گیا۔

دوسرے روز شام کو سب لوگ لان میں کُرسیوں پر بیٹھے تھے، کاظم اپنے کارنامے گنا رہا تھا اور مالک بات بات پر قہقہے لگا رہے تھے، تاجی چائے بنا کر لائی۔ سب نے پیالیاں اٹھائیں تو ناظم نے بتایا کہ "کل وُہ اپنے گھر چلا جائے گا۔"

"کیوں؟" مالک کے ہاتھ سے پیالی چھُٹتے چھُٹتے بچی۔

"کیا آپ کو اس صاف سُتھرے گھر کا حُسن اور آرام راس نہیں آیا؟" کاظم نے بڑی سنجیدہ صُورت بنا کر پُوچھا۔

"کسی ننگے بھُوکے آدمی کو ایک بہت خوبصورت جگہ لا کر کھڑا کر دو، تو تمہارا کیا خیال ہے، اُسے وہ جگہ کیسی لگے گی؟" وہ جیسے سانس لینے کو رُکا "اس پھُولوں بھرے لان میں جب تاجی کے قدم پڑتے ہیں تو تمہیں احساس نہیں ہوتا کہ خزاں قریب ہے اور خزاں کا خُون ——— !"

خالہ بی نے سہم کر ناظم کی طرف دیکھا اور کاظم نے اس کی بات کاٹ دی "بھائی میاں! آپ وہاں رہیں جہاں خزاں نہ آتی ہو، مجھے صرف اپنے باپ، خالہ بی اور سلیمہ باجی کا خیال آتا ہے۔"

"میں تاجی کو بھی اپنے ساتھ لے جانا چاہتا ہُوں۔"

"وہ ہمارے گھر کی نوکرانی ہے، وہ آپ کے ساتھ نہیں جا سکتی۔"

"خدا کے لیے تم دونوں چُپ ہو جاؤ، اسد بیٹے کے لیے میں آیا کا انتظام کر دوں گی۔" خالہ بی کی آواز کپکپا رہی تھی "ہم ذرا دیر کو خوش رہنا چاہیں تو نہیں رہ سکتے۔ ناظم میرے بیٹے —— وہ ایک دم رو پڑیں۔

"ہم سب سے تم نفرت کیوں کرتے ہو؟" مالک خاموشی سے اُٹھ کر چلے گئے۔ ساجدہ کو اُس وقت وُہ بیحد قابلِ رحم باپ نظر آئے۔

"مجھے کسی سے نفرت نہیں ہے خالہ بی!" ناظم نے کہا

"تم الگ ہوئے، سلیمہ گھر سے دُور ہو گئی۔" خالہ بی نے آنسو پونچھ لیے "کوئی میرے لیے نہیں سوچتا، میں —— میں ——!

"آپ میرے ساتھ چلیں۔" ساجدہ سے ان کا اندوہناک چہرہ دیکھا نہ گیا۔

"اب —— اس عمر میں یہ گھر، یہ ساتھ چھوڑ دوں؛ اب تو چار کاندھوں پر ہی اس گھر سے نکل سکتی ہُوں۔" وُہ اس طرح اُٹھ کر چلی گئیں۔ جیسے انہیں کوئی بہت ضروری کام یاد آگیا ہو۔

ساجدہ انھیں جاتے ہُوئے دیکھتی رہی، اُسے آج احساس ہُوا کہ ان کا بھاری جسم اب آدھا بھی نہ رہ گیا تھا، ان کی سفید رنگت میں پیلاہٹ گھُل گئی تھی۔

ناظم اسد کو گود میں لیے پیار سے دیکھنے میں منہمک تھا کہ سلیمہ پھاٹک سے داخل ہُوئی۔ ناظم کو بیٹھے دیکھ کر وہ ذرا سی جھجکی۔ پھر تیز تیز قدم اٹھاتی پاس آئی "شکر ہے ناظم بھائی کہ آپ آ گئے۔"

"تمہیں اس سے کیا مطلب کہ میں آگیا ہُوں، یا پھر چلا جاؤں گا۔"

"اُفوہ ناظم بھائی! کوئی بڑی سی بات کیجیے، ان چھوٹی چھوٹی باتوں میں کیا رکھا ہے۔" وہ جانے کے لیے پلٹی تو ساجدہ نے اس کی آنکھوں میں کچھ تلاش کرنے کی کوشش کی مگر اس کی سپاٹ آنکھوں میں تو کچھ بھی نہیں تھا۔

دُوسرے دن جب ساجدہ نے بستر اور سُوٹ کیس سنبھال لیا اور اسد کو گود میں لے کر جانے کے لیے تیار ہُوئی تو مالک کے کمرے سے ایک دم اچھلنے پھاندنے کی آوازیں آنے لگیں۔ شراب نوشی کی شدّت سے ان کی زبان میں لکنت آگئی تھی، وہ چیخ چیخ کر کہہ رہے تھے "چلے جاؤ، سب لوگ چلے جاؤ، میرے پوتے کو مجھ سے چھڑا لو، یہ باغ بغیچے کس کے لیے ہیں، ان کے پھل کون کھائے گا، ان کمروں میں کون کھیلے گا!"

خالہ بی انہیں سنبھال رہی تھیں، سمجھا رہی تھیں، مگر مالک کے دماغ پر شراب کا حملہ اتنا سخت تھا کہ وہ کچھ سوچنے سمجھنے کے لائق نہیں تھے۔ ناظم اور ساجدہ اسد کو گود میں لیے کمرے میں داخل ہوئے تو مالک بے سُدھ سے ہو کر بستر پہ گر پڑے اور ٹکٹکی باندھ کر انھیں دیکھنے لگے۔ ساجدہ گھبرا گئی۔ اسد کو اس نے ناظم کو دیا اور جلدی سے باہر نکل آئی۔ گیلری میں سلیمہ دیوار سے پیٹھ لگائے کھڑی تھی اُسے دیکھتے ہی بولی "اس گھر میں چھٹّی کا دن کاٹے نہیں کٹتا۔"

"سلیمہ باجی! آپ خالہ بی کو بہت اذیت دے رہی ہیں۔" اتنی بڑی بات اس کے منہ سے اچانک نکل گئی "آپ کو ماں کی تڑپ کا احساس ہونا چاہیے۔"

"پتہ نہیں کون کسے اذیت دے رہا ہے! خیر، تم لوگ آج جا رہے ہو؟"

"ہاں۔"

"امّاں بی سے مل آئیں ؟"

"ہم دونوں دیر تک ان کے پاس بیٹھے رہے ، ان کی دعاؤں سے دامن بھر کر اُٹھے ہیں ۔"

"ہُوں !"

"تاجی کہاں ہے ؟ میں جا رہی ہُوں اور وُہ غائب ہے ، ملنے بھی نہیں آئی ۔" ساجدہ سلیمہ سے کوئی اور بات نہیں کرنا چاہتی تھی ، وہ تاجی کے کوارٹر کی طرف تیزی سے مُڑ گئی ۔ اس نے یہ بھی نہ دیکھا کہ سلیمہ کیسی عجیب سی مسکراہٹ کے ساتھ اُسے جاتے ہُوئے دیکھ رہی ہے ، تاجی گھٹنوں میں مُنہ چھپائے دھیرے دھیرے گنگنا رہی تھی :

"دو پتّر اناراں دے

ساڈا دُکھ سُن سُن کے ، روندے پتھر پہاڑاں دے"

ساجدہ ایک لمحے کو چُپ چاپ کھڑی رہی ، پھر اس نے دھیرے سے آواز دی "تاجی !"

وُہ چارپائی سے اُٹھ کر کھڑی ہو گئی ، اس کی آنکھیں رو رو کر گلابی ہو رہی تھیں "مجھے معلوم ہے باجی ! آپ جا رہی ہیں ۔"

"ایک دن ضرور تمہیں اپنے پاس بلا لوں گی ۔" ساجدہ نے کہا تو وہ مایوسی سے ہنس دی "کل شام کلب جانے سے پہلے کاظم میاں اِدھر آئے تھے ۔ انہوں نے میرے منہ پر زور سے تھپڑ مار کر کہا تھا کہ "جب ان کی شادی ہو جائے گی تو وُہ مجھے اس گھر سے اٹھا کر ناظم میاں کے گھر پھینک آئیں گے ، ابھی اگر چیں پیں کی

تو میری لاش بھی نہیں ملے گی کسی کو۔" وہ بے بسی سے ادھر ادھر دیکھنے لگی "ویسے بھی میں کون سی زندہ ہوں، چلیے ناظم میاں سے بھی مل آؤں، اسد کو پیار کر لوں، اچھا کیا جو آپ یہاں سے جا رہی ہیں، اس گھر میں کسی کی بد دُعائیں ہیں ساجدہ باجی!"

تاجی ساجدہ کے ساتھ چلتے ہوئے سب کچھ کہے جا رہی تھی مگر ساجدہ صرف کاظم کے لیے سوچ رہی تھی۔ اس پاک سرزمین پر اگر کاظم جیسے لوگ کُرسیاں سنبھالتے رہے تو کیا ہو گا! اب وہ کتنا شیر ہو گیا ہے، اُسے کسی کا خوف نہیں ہے، کسی کا ڈر نہیں ہے۔

خالہ بی اور تاجی نے اُسے آنسوؤں کے ساتھ رخصت کیا۔ اب تک مالک کے چیخنے اور کراہنے کی آوازیں آ رہی تھیں "چلے جاؤ، سب لوگ چلے جاؤ، باغ کے پھل کون کھائے گا۔"

سلیمہ دیوار سے ٹیک لگائے کھڑی رہی، جب تانگہ چلا تو اس نے صرف ہاتھ ہلایا، اور پھر اس کا ہاتھ بے جان سا ہو کر لٹک گیا۔

لالی اور زمیندار صاحب ناظم اور ساجدہ کے آنے سے بہت خوش ہوتے۔ شام کو زمیندار کے لان میں ناظم ان سے گھنٹوں بحث کرتا رہا۔ زمیندار اس بات پر اڑے رہے کہ چھوٹا بڑا، امیر اور غریب سب خدا نے بنائے ہیں اور ناظم انہیں سمجھاتا رہا کہ خدا نے تو صرف انسان کو پیدا کیا ہے۔ چھوٹے بڑے کی تقسیم تو انسان نے کی ہے، لوٹنے والا امیر اور لٹنے والا غریب، آپ کی زمینوں پر کام کرنے والے آپ کے لیے کتنا عیش مہیا کرتے ہیں مگر ان کی حالت دیکھیے، ذرا ذرا سی خوشی کو ترستے رہتے ہیں۔

اور ایک دن تو بحث میں خاصی تلخی ہوگئی، زمیندار صاحب بہت اونچی آواز میں کہہ رہے تھے "آپ غریبوں کے حقوق کی بات کرتے ہیں، ان کے سروں پر دو لاٹھیاں پڑیں تو حقوق کا بھیجا نکل کر زمین پر پڑا ہوگا۔

"اور زمیندار صاحب! یہ لاٹھیاں اگر پلٹ پڑیں تو ——" ناظم نے بھی غصے سے جواب دیا "مگر اندھی دولت دور کی بات نہیں سوچنے دیتی۔"

"پاکستان میں آپ کے یہی خیالات رہے تو عمر جیل میں کٹے گی۔"

اس تلخی کے بعد نہ ناظم زمیندار سے ملا اور نہ لالی آئی۔ ناظم ابھی اتنا کمزور تھا

کہ سارا دن بستر پر پڑا رہتا، وہ کتابوں سے جی بہلاتا یا پھر اخبار پڑھتا رہتا، کچھ وقت اسد سے کھیل کر گزارتا، قید میں اس کا معدہ اور جگر دونوں ہی خراب ہو گئے تھے، ساجدہ نے ایک قریبی اسکول میں ملازمت کر لی تھی۔ اس کی تنخواہ سے گھر کسی نہ کسی طرح چل رہا تھا۔ ساجدہ کو محسوس ہوا کہ اس کی طبیعت پھر خراب ہو رہی ہے مگر اس نے ناظم سے کچھ نہ کہا، وہ نہیں چاہتی تھی کہ ناظم پریشان ہو یا اس کے دل و دماغ پر بوجھ پڑے۔ جس وقت وہ ٹانگ کھینچ کر چلتا تو ساجدہ کا دل کٹنے لگتا تھا۔

گھر کا کام، بچّے کی دیکھ بھال، اسکول میں پڑھانا، ناظم کی خدمت —— اُسے اتنی مہلت ہی نہ ملتی کہ کوئی بھولی بھٹکی یاد اس کے پاس سے بھی گزرے۔ قادیانیوں کے خلاف تحریک تیز ہوئی تو اسکول اور کالج بند کر دیے گئے۔ ساجدہ کو بھی دن کا زیادہ وقت گھر میں گزارنے کا موقع ملا، وُہ ناظم پر ظاہر تو نہ کرتی مگر اندر ہی اندر ڈرتی رہتی۔ ایک دن وہ کھانا گرم کر رہی تھی کہ کسی نے باہر کا دروازہ کھٹکھٹایا، ساجدہ کا دل زور سے دھڑکا کہ کہیں ناظم کا پھر بلاوا تو نہیں آگیا! ہر دستک پر اس کا دل بُری طرح دھڑک اُٹھتا تھا۔

اس نے دروازہ کھولا تو سامنے زمیندار صاحب کھڑے تھے، انہوں نے بڑی محبّت سے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا "آپ ناراض ہو جائیں مگر ہم لوگ جسے بہن کہتے ہیں اس سے ہمیشہ نبھاتے ہیں، کہاں ہیں ناظم صاحب؟"

"اندر آجایئے بھائی صاحب!" اس نے مسرت سے جواب دیا اور انہیں ناظم کے پاس لے آئی جو اخبار پڑھتے ہوئے سخت فکر مند نظر آرہا تھا۔

"قادیانیوں سے سخت فساد ہو رہا ہے، پڑھ لی خبر آپ نے؟ بہت سے لوگ مر گئے ہیں، دکانیں لُوٹ لی گئی ہیں، اور پولیس کو دیکھو اپنے ہی لوگوں پر گولیاں چلا رہی ہے، بھئی لُوٹنے دو، قادیانی کوئی مسلمان ہیں، حد کر دی اپنی حکومت نے، اتنے بڑے بڑے اللہ والے عالموں کو پکڑ لیا ہے ان جہنّمیوں کے پیچھے۔" زمیندار صاحب ایک ہی سانس میں سب کچھ کہہ گئے۔

"یہ تو ٹھیک ہے کہ اللہ والے عالموں کو چاہیے کہ ساری دنیا کے کافروں کو ختم کر دیں، مگر زمیندار صاحب! یہ تو بتائیے کتنی بڑی دوزخ ہو گی جہاں یہ سب جائیں گے؟ جنّت تو صرف آپ جیسے مسلمانوں کے لیے ہے نا!"

"دیکھیے ناظم صاحب! یہ مذاق کا وقت نہیں ہے۔"

احاطے سے ایک دم زور زور سے رونے کی آوازیں اُٹھیں، ساجدہ گھبرا کر دروازے کے پاس گئی۔ احاطے میں خُون سے لتھڑی ہوئی لاش لا کر رکھی گئی تھی، عورتیں چارپائی کے گرد کھڑی ہو کر ماتم کر رہی تھیں، وہ سینہ کُوٹ کوٹ کر نوجوانوں کو للکار رہی تھیں "جاؤ، ایک کے بدلے میں دس کو مار کر شہید ہو جاؤ۔"

ساجدہ کو چکّر آنے لگا۔ خُون، فساد، دہلی کی گلیاں، مہاجر کیمپ، سب آنکھوں تلے گھوم گیا۔ وُہ جانے کس طرح خود کو سنبھالتی ہوئی کمرے میں آئی۔

"کیا ہوا؟" ناظم نے اسے سہارا دے کر کرسی پر بٹھا دیا

"لاش آئی ہے خُون میں لت پت۔" اس نے کرسی کی پشت سے ٹیک لگا کر آنکھیں بند کر لیں۔

ناظم نے جلدی سے ریڈیو آن کیا، لاہور میں مارشل لاء لگا دیا گیا ہے، ریڈیو پر مارشل لاء ریگولیشنز سنائے جا رہے تھے۔

"نااہل حکمرانوں کا سب سے خوفناک کارنامہ۔" ناظم نے دُکھ سے آنکھیں بند کر لیں۔

"مَیں ذرا گھر چل کر دیکھوں، نوکر چاکر تماشہ دیکھنے نکلے ہوئے تھے، مردود مارے نہ جائیں مفت میں۔" زمیندار صاحب جانے کے لیے کھڑے ہو گئے۔

"آپ فکر نہ کریں، زمینداروں کے نوکروں کو بھی گولی پہچانتی ہے۔"

وہ ناظم کی بات کا جواب دیئے بغیر چلے گئے۔

رونے کی آوازیں بے حد دردناک تھیں۔ ساجدہ سوچ رہی تھی غریبوں کے بچّے کتنی مشکل سے پلتے ہیں اور کتنی آسانی سے انھیں مرنے کے لیے آگے کر دیا جاتا ہے، اور انہیں آگے دھکیلنے والوں کے خراش تک نہیں آتی۔ رات بھر رونے کی صدائیں آتی رہیں، اس نے ناظم کو نیند کی دوا دے کر سلا دیا تھا مگر خود ساری رات کروٹیں بدلتی رہی، طرح طرح کے خیال آسیب بن کر اس کی نیند اڑا رہے تھے۔ ایک دوبار اس نے یہ بھی سوچا کہ ہمارا ڈپٹی کمشنر آج کل کیا کر رہا ہو گا! وہ خون کی اس ہولی سے کتنا خوش ہو گا!

صبح جنازہ اُٹھا تو مارشل لاء کے خوف سے صرف نو دس آدمی کاندھا دینے والے نظر آئے۔ عورتوں کی چیخ و پکار بھی سسکیوں میں بدل گئی۔ ناظم بار بار کہے جا رہا تھا "یہ مارشل لا کہیں مستقبل کی سیاہ آندھی ثابت نہ ہو!"

ساجدہ خاموشی سے اس کی باتیں سنتی رہی، وہ سخت بے چینی کے عالم

میں دو کمروں کے گھر میں ایک ساں ٹلے جا رہا تھا۔

"تم ذرا دیر آرام کرو۔" ایک بار تو ساجدہ کو غصہ آ گیا "جب تم کچھ کر نہیں سکتے تو پھر کیا فائدہ ——— !"

اور ناظم بجھے سے دل کے ساتھ چپ چاپ بستر پر لیٹ گیا۔

مارشل لا کی دہشت ذرا کم ہوئی تو دوسری بڑی خبر سنائی گئی دولتانہ صاحب نے وزیرِ اعلیٰ کے عہدے سے استعفا دے دیا ہے۔

"جب سے پاکستان بنا ہے کتنی وزارتیں برطرف کی گئی ہیں، اور یہ کون سی وزارت کا استعفا ہے؟" ناظم نے بے خیالی میں پوچھا

"مجھے یاد نہیں"۔ ساجدہ نے بے دلی سے جواب دیا اور اسد کو کپڑے پہنانے میں لگی رہی۔

شام کو ناظم کے دوست آ گئے۔ کمرے کی خاموشی میں ایک دم ہلچل مچ گئی۔ مارشل لا اور دولتانہ کے استعفا پر بڑے زور شور سے بحث ہو رہی تھی۔ ساجدہ نے جلدی سے چائے بنا کر تپائی پر لگا دی تاکہ سکون سے سب کی باتیں سن سکے۔ سب کچھ نہ کچھ کہے جا رہے تھے، انہیں کئی دن کے بعد بولنے کا موقع ملا تھا مگر ناصر خاموش بیٹھا تھا۔

"کیا تم پر اب تک مارشل لا کی دہشت طاری ہے؟"

"مجھ پر کچھ بھی طاری نہیں۔" ناصر نے آہستہ سے جواب دیا "میں تو تم سب لوگوں کی باتیں سن رہا تھا، اور اب تمہیں بتاؤں کہ دولتانہ نے استعفا نہیں دیا تھا ڈیفنس سیکرٹری جنرل سکندر مرزا نے ان سے اس طرح استعفا لکھوایا تھا جیسے

کسی سے شرط باندھ کر کراچی سے آئے ہوں اور پھر استعفا کا کاغذ گورنمنٹ ہاؤس کی بالکونی سے لہرا کر دکھایا، بیچارے خواجہ ناظم الدین کو تو مارشل لا لگنے کی خبر بھی بعد میں معلوم ہوئی تھی، اب تو وہ نام کے وزیر اعظم ہیں۔"

ایک ذرا دیر کو کمرے میں سناٹا چھا گیا، شاید سب سوچ رہے تھے کہ اب بیوروکریسی کی حکومت پوری طرح اپنا صور پھونکے گی، باہر کے دروازے پر آہستہ سی دستک ہوئی، سب چوکنا ہو گئے۔"تم لوگ کچھ عرصہ میرے گھر مت آؤ، میں پٹے ہوئے مہرے کی طرح بے دست و پا پڑا ہوں۔ یونہی کسی مصیبت میں نہ پھنس جاؤ، کچھ کام کرنے کے بعد ظلم سہے جائیں تو کم از کم سکون تو ملتا ہے۔"

"میں دیکھتی ہوں کون ہے!" ساجدہ نے دروازے کے قریب جا کر پوچھا "کون ہے؟"

"لالی۔"

ساجدہ نے جلدی سے دروازہ کھول دیا، وہ اندر آ کر دروازے کے ایک طرف کھڑی ہو گئی "تمہارے بھائی کہتے ہیں کہ ابھی ناظم صاحب کے پیچھے سی آئی ڈی لگی ہوئی ہے اتنے لوگوں کو جمع کر کے زور زور سے باتیں نہ کریں، شام کے سناٹے میں آواز دور تک جاتی ہے، یہ مٹھائی بھی رکھ لو، ناظم بھائی تو ابھی اچھی طرح چل پھر بھی نہیں سکتے، چائے کے ساتھ مہمانوں کو کھلا دینا۔" مٹھائی کا ڈبہ ساجدہ کے ہاتھ میں تھما کر وہ فوراً چلی گئی۔

"کون تھا؟" ناظم نے پوچھا

"لالی مہمانوں کے لیے مٹھائی دینے آئی تھی اور کہہ رہی تھی کہ شام کی خاموشی

میں آوازیں بہت دُور تک سنائی دیتی ہیں"۔

"کہیں تمہارے زمیندار صاحب ہماری مخبری تو نہیں کرتے؟" ناصر نے فکرمند ہو کر پُوچھا

"نہیں، وہ ایسے کام نہیں کرتے، میں اگر ان سے ٹکّر لُوں تو پھر وہ میرے دشمن ہو سکتے ہیں، ویسے میرے جیسے معمولی آدمی سے کیا دشمنی کریں گے! ملکی حالات پر مجھ سے بحث کر کے کچھ نہ کچھ حاصل ہی کر لیتے ہیں"۔

شاید سب کو مٹھائی بھی کڑوی لگ رہی تھی، وہ ایک ایک کر کے چند منٹوں میں چلے گئے۔

دروازہ بند کر کے ساجدہ اسد کے ساتھ اپنے بستر پر لیٹ گئی۔ ناظم کسی گھری فکر میں غرق تھا۔

"ایک بات پُوچھوں؟" ساجدہ نے آہستہ سے کہا

"پوچھو"۔

"قلعے میں وہ تم سے کیا معلوم کرنا چاہتے تھے؟"

"وہ سب کچھ جو انہیں پہلے سے معلوم تھا"۔

"کیا؟"

"یہی کہ میں جمہوریت، انصاف اور مساوات کا قائل ہُوں، قلم اور زبان پر پابندیوں کے خلاف ہُوں، حکومت پر تنقید کرتا ہُوں"۔

"اس میں کیا بات ہے؟"

"ان کی سمجھ میں یہ بات نہیں آتی تھی کہ میں نہ اسمبلی کا ممبر بن سکتا ہُوں اور

نہ زرعی اصلاحات کے ذریعے زمین کا ایک ایکڑ حاصل کرسکتا ہوں۔ پھر میں کس کے لیے اور کس کے اشارے پر جمہوریت اور مساوات کی حمایت کرتا ہوں اور حکومت کے کاموں میں دخل دیتا ہوں۔" ناظم جیسے اپنے آپ سے بول رہا تھا "انھیں تو یہ بھی بُرا لگتا تھا کہ میں پاکستان کو ایک مثالی ملک بنانے کا خواب دیکھتا ہوں اور اس کی بقا اور ترقی کا حامی ہوں، انہیں ان تمام باتوں میں سازش کی بُو آتی تھی اور وہ سازش کا پتہ چلانا چاہتے تھے۔"

"پھر کیا؟"

"پھر کیا! جب میں نے انہیں یقین دلا دیا کہ میں بھی ان کی طرح پاکستان کو من و سلویٰ سمجھ کر کھا جاؤں گا تو مجھ پر جو عذاب ابھی نازل ہونا تھے وہ ختم کر دیئے گئے اور میں رہا ہو گیا!"

"کیا واقعی ناظم! تمھاری بھوک اتنی جاگ سکتی ہے؟"

"نہیں، مگر مجھ میں مزید عذاب سہنے کی طاقت نہیں رہ گئی تھی، آدمی آخر کتنی دیر برف کی سل پر لیٹ سکتا ہے، اور ــــــ" وہ ذرا دیر کو رُکا" اور قید میں رہنے سے بہتر ہے کہ انسان جھوٹ بول کر رہا ہو جائے۔ کچھ اور پوچھنا ہے؟"

"نہیں۔"

دونوں بہت دیر تک خاموش رہے۔

گھر سے ایک آدھ میل کے بعد آبادی کا نام و نشان نہ تھا۔ رات کو سیاروں کے بولنے کی آواز بہت صاف سنائی دیتی تھی، اس وقت بھی کتّوں کے بھونکنے اور سیاروں کے بولنے کی آواز سے اسد چونک رہا تھا، ساجدہ نے اُسے سینے سے

لگالیا، اس نے دیکھا کہ ناظم اسے کھوئی کھوئی نظروں سے دیکھ رہا ہے، اس کی آنکھوں میں بیتے ہوئے دُکھ اور اذیتیں جاگ رہی تھیں، ساجدہ اپنے سوالوں پر شرمندہ ہو رہی تھی، اس نے آنکھیں اس طرح بند کرلیں جیسے سو گئی ہو۔ وہ بڑی دیر تک ناظم کی کروٹوں کی آہٹ محسوس کرتی رہی۔

اسکول سے آکر اُوپر تلے کے بچّوں کو سنبھالنے اور گھر کا کام کرنے کے بعد وہ اتنی تھک جاتی کہ بستر پہ لیٹتے ہی سو جاتی۔ جب بھی اس کی آنکھ کھلتی تو وہ دیکھتی کہ نیلام میں خریدی ہوئی چھوٹی سی رائٹنگ ٹیبل پر جھکا ہوا ناظم کچھ لکھ رہا ہوتا۔ وہ کروٹ بدل کر پھر سو جاتی۔

صبح تڑکے اٹھتی، ناشتہ تیار کرتی، اسد اور احمد کے کپڑے تبدیل کراتی اور پھر دونوں کو ناظم کے سپرد کر کے اسکول چلی جاتی، ناظم کو ابھی تک کسی ملازمت نے قبول نہیں کیا تھا، مالک کے گھر سے تو جیسے ناطہ بالکل ٹوٹ گیا تھا۔ احمد کی پیدائش پر صرف خالہ بی اُسے دیکھنے آئی تھیں، بہت کمزور ہو گئی تھیں۔ بڑی دیر تک بیٹھی روتی رہیں۔ انہوں نے بتایا کہ مالک نے قسم کھائی ہے کہ وہ نہ تو خود ناظم کے گھر جائیں گے اور نہ اپنے گھر سے کسی کو جانے دیں گے، ناظم نے ان کی محبت کو ٹھکرایا ہے، وہ خود الگ ہو گیا ہے، اس کے ہاں جانے کا سوال ہی نہیں ہے، ہاں ان کے گھر کے دروازے اس کے لیے کھُلے ہیں، وہ جب چاہے یہاں آسکتا ہے۔ اور ناظم نے ساجدہ کے روکنے کے باوجود نفرت سے کہا تھا کہ مالک سے کہیے کہ وہ سارے دروازے بند کر لیں، صرف میری ماں کے

کمرے کا دروازہ کھلا رہے اور بس!" میں اپنی ماں سے مل آتا ہوں، اور کسی کو معلوم نہیں کہ کب اور کس وقت!"

"اور تم مجھ سے نہیں ملتے۔" خالہ بی کی آواز میں بےحد حسرت تھی۔ ناظم نے کوئی جواب نہ دیا تھا وہ احمد سے کھیلنے میں مصروف تھا، چند منٹ تک وہ ناظم کو دکھ سے دیکھتی رہی تھیں اور پھر ساجدہ سے باتیں کرنے لگیں، انہوں نے کہا کہ سلیمہ اب ہوسٹل میں رہنے لگی ہے، وہ ماں کی محبت سے بھی بیزار ہے، کاظم ایک لڑکی میں دلچسپی لے رہا ہے وہ آج کل اُسے اپنے ساتھ کلب لے جاتا ہے، لڑکی کا باپ بہت امیر آدمی ہے، کاظم کہتا ہے کہ لڑکی بھی شریف ہے اور اس کا خاندان بھی بڑا شریف اور عزت والا ہے۔ تاجی تم دونوں کو یاد کرتی ہے تو بہت روتی ہے۔"

خالہ بی اتنی بہت سی باتیں کرتی رہی تھیں اور وہ صرف ان کا منہ دیکھتی رہی تھی، ان کی آنکھوں میں جیسے سارے زمانے کا دُکھ سمٹ آیا تھا۔ لٹا ہوا چہرہ کیا کھویا اور کیا پایا کا سوالیہ نشان بنا ہوا تھا۔

جانے سے پہلے انہوں نے ساجدہ سے وعدہ لیا کہ وہ کبھی کبھار گھڑی دو گھڑی کو گھر آجایا کرے۔ وہ ذرا دیر کو یہ سوچ کر ہی خوش ہو لیا کریں گی کہ سلیمہ آئی ہے۔

"آپ سلیمہ کے پاس کبھی نہیں جاتیں؟" ساجدہ نے پوچھا تھا

"جاتی ہوں، کئی بار گئی ہوں مگر وہ ہر بار کہتی ہے کہ میں یہاں خوش ہوں، آپ گھر سے نہ نکلا کریں ورنہ کسی وقت زلزلہ آجائے گا اور سارا گھر اڑاڑا دھم ہو جائے گا، میں ان باتوں کا مطلب خوب سمجھتی ہوں بیٹی!" اور وہ دیر تک خلا میں جانے کیا تکتی رہی تھیں، ساجدہ کو اپنی ہندو سہیلی یاد آگئی تھی جو کہا کرتی تھی

کہ زمین کو گائے نے اپنے سینگوں پر اٹھا رکھا ہے وُہ جب سینگ بدلتی ہے تو زلزلہ آجاتا ہے۔

"کیا مل جاتا ہے سلیمہ کو اپنی ماں پر طنز کر کے!" خالہ بی کے جانے کے بعد وُہ دیر تک سلیمہ کے متعلق سوچتی رہی، اس کی ساری بے اعتنائیوں کے باوجود وہ اب تک سلیمہ سے محبّت کرتی تھی۔

دوپہر کو لالی آئی تو اس کا چہرہ سُرخ ہو رہا تھا اور پپوٹے سُوجے ہوئے تھے، وہ اِس طرح گھسٹتی ہوئی اس کے پاس آکر دھم سے بستر پر گر پڑی جیسے کھڑے ہونے کی سکت نہ ہو، پھر وُہ پھُوٹ پھُوٹ کر رونے لگی۔

"کیا ہوا ہے لالی؟" ساجدہ نے اسے لپٹا لیا "آخر کچھ تو بولو۔"

"وہی جو ہمیشہ ہوتا ہے، آج اُسے پھر زمین کے وہ مربّعے یاد آ گئے جو میرے باپ نے نکاح کے بعد اُسے دینے سے انکار کر دیا تھا۔"

"پھر؟"

"وُہ میرے باپ کو گالیاں دے رہا تھا، میں نے کہا میرا باپ جیسا کچھ ہے اسے میرے سامنے گالی مت دو، بس ——"

"تم کچھ عرصے کے لیے مائیکے کیوں نہیں چلی جاتیں، جب تم نہیں ہو گی اس بڈھے کو پتہ چل جائے گا۔"

"میرا کوئی مائیکہ نہیں ہے، میری ماں مر گئی، باپ نے دوسری شادی کر لی، بھائی پچیس مربعوں کا مالک ہے مگر وہ مجھ سے ڈرتا ہے کہ کہیں مجھے کچھ دینے پر مجبور نہ ہو جائے، دولت بہت بُری چیز ہوتی ہے باجی! اِس آدمی کے

چار جوان جوان بیٹے ہیں، مجھ سے تو اولاد بھی نہیں ہوئی، اس نے اپنے بیٹوں سے یہ کہہ کر شادی کی تھی کہ تمہیں ایک نوکرانی مل جائے گی اور چار چھ مربعے زمین بھی۔"

"دیکھ لالی!" ساجدہ اُٹھ کر بیٹھ گئی "تم پڑھی لکھی بھی نہیں ہو، میرا مطلب ہے تمہارے پاس کوئی ڈگری بھی نہیں ہے جو اپنے پیروں پر کھڑی ہو جاؤ، ہاں تم بہت خوب صورت اور کم سن ہو، تمہیں زمیندار صاحب بڑھاپے میں کبھی نہیں چھوڑیں گے مگر مربعوں کی یاد ان کے دل سے نہیں نکلے گی، وہ تمہیں بے حد پسند کرتے ہیں ورنہ یہاں الگ کوٹھی لے کر نہ رہتے، ایک دو مربعوں کی آمدنی تو وہ اِس گھر اور اس کے نوکروں پر خرچ کر دیتے ہیں۔"

"پھر میں کیا کروں باجی! میں مار کھا کر تنگ آ گئی ہوں۔ سارا سُکھ دُکھ بن گیا ہے، میں کہاں جاؤں!" وہ پھر رونے لگی۔

"تم روئیں تو میں کوئی بات نہیں کروں گی۔" ساجدہ نے سنجیدگی سے کہا اور اس کی طرف سے منہ موڑ لیا۔

"پھر کیا کروں؟" لالی نے جلدی سے آنسو پونچھ لیے۔

"بس یہی کہ وہ جب تمہیں ماریں تو تم بھی جواب میں انہیں مارو۔"

"میں ماروں؟" لالی کی آنکھیں حیرت سے پھٹ گئیں۔

"ہاں تم، جب تک تم مار کھاتی رہو گی وہ مارے جائیں گے، مگر جب تمہارا ہاتھ اُٹھے گا تو پھر ——————"

"وہ مجھے گھر سے نکال نہ دیں گے؟" وہ خوف زدہ ہو رہی تھی۔

"وہ تمہیں کبھی نہیں نکالیں گے، اور اگر نکال دیا تو میں ساری زندگی تمہارا

ساتھ دوں گی، میں تمہارے پاؤں دھلاؤں گی۔ میں تمہارے بالوں میں کنگھی کروں گی اور ——"

لالی ہنس پڑی اور پھر جیسے ہی نوکر بلانے آیا تو چلی گئی۔

ساجدہ تھوڑی دیر تک سوچتی رہی کہ لالی نے اگر اس کے مشورے پر عمل کیا تو ! کہیں وہ سچ مچ اُسے نکال نہ دے؟ پھر اسے یہ سوچ کر اطمینان ہو گیا کہ لالی اس کے مشورے پر کبھی عمل نہیں کرے گی، دولت ساری چوٹوں پر مرہم بن کر لگ جاتی ہے۔

وہ دیر تک سونا چاہتی تھی کہ ناظم آ گیا، وہ ضرورت سے زیادہ خوش نظر آرہا تھا، اُس نے آتے ہی بتایا کہ اُسے ایک ہفت روزہ رسالے میں کام مل گیا ہے، پیسے تھوڑے ہیں مگر بے کاری سے تو نجات مل جائے گی۔

"تم نے بیکاری کو ویسے ہی زیادہ محسوس کیا، گھر میں کوئی تکلیف تو نہیں تھی"۔

"تمہارے ساتھ رہ کر میں نے سوائے مسرت کے کچھ محسوس نہیں کیا ساجدہ!"

اور وہ اسے اتنی محبت سے دیکھنے لگا کہ ساجدہ کی نظریں جھک گئیں۔

"مگر، مگر —— میں اتنی اچھی تو نہیں ہوں —— میں تمہارے لیے چائے بنا لاؤں"۔ وہ بستر سے اُٹھ کر چل پڑی۔ اتنا زمانہ گزر جانے کے بعد بھی ساجدہ ناظم کی محبت بھری نظروں سے شعوری طور پر کتراتی کی کوشش کرتی تھی، وُہ سوچنے لگتی تھی کہ یہ شخص کیسا ہے، سب کچھ جانتے بُوجھتے بھی اُس سے محبت کرتا ہے، اس نے صلاح الدین کا کبھی ذکر نہیں کیا، محبت کی طرح بعض اوقات نفرت بھی اندھی ہوتی ہے، وہ جس شخص سے نفرت کرتی تھی وہ کتنا عظیم تھا —— پھر بھی

وہ کوشش کے باوجود اس سے محبت نہ کرسکی، وہ اُسے اپنے بچّوں کے باپ کے سوا کوئی درجہ نہ دے سکی۔

چائے بناتے ہوئے اُس کا جی رہ رہ کر امنڈ رہا تھا، وُہ چاہتی تھی کہ روئے اور جی بھر کر روئے۔ مگر اپنی شادی پر رونے کے بعد جیسے اس کی آنکھوں کے سوتے ہمیشہ کے لیے خشک ہو گئے تھے۔

چائے پیتے ہوئے ناظم نے بتایا" آج اماں بی کے پاس گیا تھا، وُہ تمہیں بہت پیار کہہ رہی تھیں۔"

"خالہ بی سے نہیں ملے، سنا ہے وہ بیمار ہیں۔"

"نہیں میں انہیں دیکھنے نہیں جا سکا، میں نہیں چاہتا کہ مالک کو گھر میں میری موجودگی کا علم ہو۔"

ساجدہ خاموشی سے احمد کو پھونک کر چائے پلاتی رہی، کسی نے دروازہ کھٹکھٹایا تو ناظم باہر چلا گیا اور رات کو اس وقت واپس آیا جب وہ بے ہوش سو رہی تھی۔ دروازے پر مسلسل دستک سے اُس کی آنکھ کھلی، اس نے دروازہ کھولا ناظم شرمندہ سا کھڑا تھا۔

"مجھے مضمون لکھنا تھا، صبح پرچہ پریس میں جانا ہے۔"

"کھانا کھاؤ گے؟"

"نہیں تم سو جاؤ، میں کھا کر آیا ہُوں۔"

وہ اسکول سے آئی تو مالی دروازے پر کھڑا ملا، وہ سخت بوکھلایا ہوا تھا۔

"باجی! آپ گھر چلیئے، آپ کو خالہ بی نے بلایا ہے۔"

"بات کیا ہے؟" ساجدہ گھبرا کر اس کا منہ تک رہی تھی۔

"بس جی —— آپ بس گھر چلیں، تانگہ کھڑا ہے۔" مالی کچھ بتانے کو تیار نہیں تھا۔

ساجدہ نے جلدی سے تالا کھولا، بچوں کے بستے اندر رکھے اور پھر تالا لگا دیا "تم دونوں ماسی لالی کے پاس کھیلنا، میں ذرا دیر میں آجاؤں گی۔" بچوں کی انگلیاں تھامے وہ تیزی سے لالی کے پاس گئی اور چابی اسے دے کر بتا آئی کہ ناظم آئیں تو ان سے کہہ دینا کہ گھر جا رہی ہوں، مالی لینے آیا ہے، شام تک آجاؤں گی، اتنی دیر بچوں کا خیال رکھنا میری بہن!

لالی جانے کیا پوچھتی رہی، اس نے کچھ نہ سُنا، بھاگتی ہُوئی باہر نکلی اور تانگے میں بیٹھ گئی۔ راستے بھر برے برے خیال ستاتے رہے۔ خالہ بی کہیں زیادہ بیمار تو نہیں ہیں، مالک کو تو کچھ نہیں ہو گیا، کبھی کبھی تو اتنی پی لیتے ہیں کہ لگتا ہے دم نکل جائے گا۔

گھر پہنچی تو خالہ بی پھاٹک کے پاس کھڑی تھیں، مارے کمزوری کے دیوار کا سہارا لیے ہوئے تھیں، انہوں نے ساجدہ کو لپٹا لیا۔

"کیا ہوا ہے خالہ بی؟"

"اندر چلو میرے کمرے میں"۔ خالہ بی ساجدہ کے سہارے اپنے کمرے تک پہنچیں وہ اپنے آپ گھسٹ رہی تھیں۔

"ساجدہ! اس گھر کی عزت ایک بار اور بچا لو، تاجی کی حالت بہت خراب ہے وہ مر رہی ہے، اسے ہسپتال لے جاؤ۔"

ساجدہ نے ان سے کچھ نہ پوچھا، وہ بھاگی ہوئی تاجی کے کوارٹر میں چلی گئی۔ تاجی نیم بے ہوش پڑی تھی۔ اس کا چہرہ سُوجا ہوا تھا۔

"تاجی!" اس کے چہرے پر جھک کر ساجدہ نے آواز دی، جواب میں اس کے ہونٹ آہستہ آہستہ ہلنے لگے، نہ جانے وہ کیا کہہ رہی تھی۔

مالی اپنے صافے سے آنسو پونچھ رہا تھا "بڑے لوگوں کو کوئی کیا کہہ سکتا ہے ساجدہ بی بی! غریب صرف دیکھتا ہے بولتا نہیں ہے، ہماری کوئی زبان نہیں ہوتی ساجدہ بی بی! اللہ ہمیں گونگا پیدا کرتا تو کتنا اچھا ہوتا!"

"مالی! یہ باتیں پھر کرنا، جلدی سے کھاٹ پکڑو اور کار تک لے چلو۔"

دونوں نے مل کر کھاٹ اٹھائی اور کار تک لے گئے۔ پھر مالی اور ڈرائیور نے مل کر تاجی کو کار کی پچھلی سیٹ پر لٹا دیا، ساجدہ نے اس کا سر اپنی گود میں رکھ لیا۔

"دو ٹکے کی چھوکری کے کیا ٹھاٹ ہیں، صاحب نے کار بھیجی ہے اس

کے لیے!"

"بکواس بند کرو اور گاڑی تیز چلاؤ۔" ساجدہ نے سختی سے کہا، وہ جانتی تھی کہ کاظم کی گاڑی چلانے والا وہ شخص ہے جو اس کی عدالت کے باہر ملزموں اور سائلوں کے نام پکارتا ہے اور شام کو دونوں جیبیں بھر کر واپس آتا ہے۔

گاڑی ہسپتال کے گیٹ میں داخل ہوئی تو گھنٹی بجنے لگی۔ دو آدمی اسٹریچر لیے گاڑی کے پاس آ گئے۔

ساجدہ اسٹریچر کے پہیوں کے ساتھ ساتھ جیسے بھاگ رہی تھی، وہ تاجی کے ٹھنڈے چہرے پر بار بار ہاتھ پھیرتی جا رہی تھی، تاجی کے ہونٹ مسلسل ہل رہے تھے وہ جانے کیا کہہ رہی تھی، اس وقت کون سنتا، کون رکتا!

ذرا دیر میں ایمرجنسی وارڈ کے ایک کونے میں اسٹریچر کھڑا تھا۔ معلوم ہوا کہ ڈاکٹر ایک آپریشن کرنے کے بعد اب چائے پی رہا ہے، ساجدہ مارے بے چینی کے ادھر ادھر ٹہلتی اور پھر تاجی پر جھک جاتی۔ اس کا متغیر ہوتا ہوا چہرہ جیسے آہستہ آہستہ ڈوب رہا تھا۔

"تاجی —— تاجی —— !" ساجدہ اس کے کانوں کے پاس آہستہ آہستہ پکارنے لگی۔ ایک بار تاجی نے اس طرح آنکھیں کھولیں جیسے صدیوں کی مشقت کا بار اس کی آنکھوں پر آ پڑا ہو۔

"تم کیا کہہ رہی ہو تاجی —— کیا؟"

تاجی نے پھر آنکھیں بند کر لیں۔ اس کے سیاہ پپڑیائے ہوئے ہونٹ اب بھی لرز رہے تھے۔ وہ تاجی کے ہونٹوں پر جھک گئی۔ ٹھنڈی ٹھنڈی گھٹی سانسوں

میں وہ بدبدا رہی تھی "اماں ـــــ وہ شریف ہاتھ نہیں ملا۔ اماں! نہیں ملا، کوئی نہیں ملا، میرے ـــــ" پھر آواز ڈوب سی گئی۔

"تاجی ـــــ تاجی! تم کیا کہہ رہی ہو؟" مگر اب تاجی کے ہونٹوں نے لرزنے سے بھی انکار کر دیا تھا۔

"سسٹر!" ساجدہ زور سے چیخی۔ اس نے پاس کھڑی ہوئی نرس کو شانوں سے پکڑ لیا "کہاں ہیں ڈاکٹر؟ ان کی چائے کب ختم ہوگی؟"

"یہ اسپتال ہے، آپ اتنا شور کر رہی ہیں۔" ڈاکٹر اپنے کمرے سے نکل کر ساجدہ کے سامنے کھڑا ہوگیا، اس کی تیوری پر بل پڑے ہوئے تھے۔

"کیا ہم انسان نہیں ہیں، کیا ہمیں دو گھونٹ چائے پینے کی بھی اجازت نہیں ہے۔"

"ڈاکٹر صاحب! آپ ـــــ" ساجدہ کچھ کہہ نہ سکی

ڈاکٹر تاجی پر جھکا، اس کی نبض دیکھ رہا تھا۔

"ڈاکٹر صاحب آپ مجھے پہچانے نہیں، میں ساجدہ ہوں، میرے ابا کیمپ میں مر گئے تھے، آپ ان دنوں کیمپ میں تھے۔" اس کی آواز رندھ گئی "تاجی کو بچا لیجئے ڈاکٹر صاحب!"

ڈاکٹر نے پلٹ کر اس کی طرف ایسی نظروں سے دیکھا جن میں صرف حقارت تھی، ایک مشہور گائنا کالوجسٹ کو کیمپ کی یاد دلا کر اس کی ہتک کی جا رہی تھی۔

"یہ ختم ہو چکی ہے"۔ ڈاکٹر نے سرد لہجے میں کہا۔ نرس نے آگے بڑھ کر چادر تاجی کے چہرے پر کھینچ دی۔ "آپ لوگ مریض کو گھر میں ختم کر لیتے ہیں تو پھر اسپتال

یاد آتا ہے۔" ڈاکٹر اپنے کمرے میں واپس چلا گیا۔

ساجدہ کو جیسے سکتہ سا ہو گیا تھا، ساری کاغذی کارروائی کے دوران وہ روتے ہوئے مالی کو ٹکر ٹکر دیکھتی رہی۔

اور جب وہ واپس گھر جا رہی تھی تو مالی نے روتے ہوئے آہستہ سے کہا تھا "ساجدہ بی بی! مجھے تو ایسا جان پڑتا ہے کہ تاجی میری بیوی تھی، کلیجے کو کوئی نوچے لیتا ہے۔ آپ لوگ میرا نام کیوں لکھواتے تھے، کیوں —؟" وہ انگوچھے کو منہ پر رکھ کر ایک بار زور سے رویا اور پھر چُپ ہو گیا۔

ڈپٹی کمشنر کے گھر آ کر کون پوچھتا کہ کون ملازم کیسے مر گیا، بس موت آئی تھی مر گیا۔ غسّالہ نے ذرا سی دیر میں تاجی کو آخری سفر کے لیے تیار کر دیا، آخری دیدار کرتے ہوئے خالہ بی زور زور سے رو رہی تھیں اور امّاں بی چُپ چاپ کھڑی انہیں گھورے جا رہی تھیں، مالک کو بتایا گیا کہ تاجی میعادی بخار میں مر گئی۔ وہ پوری بوتل چڑھا کر تاجی کی موت کا غم بھلانے کے لیے اِدھر اُدھر ڈولتے پھر رہے تھے۔ وہ ہکلا ہکلا کر ایک ہی رٹ لگائے ہوئے تھے "اب ایسے پراٹھے کون پکائے گا! — تاجی مر گئی، ایسے پراٹھے —!"

"خدا حافظ تاجی!" اس نے تاجی کی سرد پیشانی کو چُوما اور بھاگتی ہوئی تاجی کی کوٹھری میں گھس گئی۔

ویران کوٹھری میں کچّے کچّے خون کی بُو پھیلی ہوئی تھی، طاق میں رکھی ہوئی لالٹین ابھی تک ٹمٹما رہی تھی، اس نے تاجی کا میلا سا تکیہ اٹھا کر سینے سے لگا لیا، وہ جو مدتوں سے ایک ایک آنسو کو ترس رہی تھی، پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی "تاجی! ایک دن ایسا ضرور آئے گا جب ایسی کوٹھریوں سے کچّے خون کی بُو نہیں آئے گی، نہیں آئے گی تاجی!" وہ بڑے یقین سے اس طرح کہہ رہی تھی جیسے تاجی اس کے

سامنے کھڑی ہو اور اس یقین کے سہارے سے اس نے اپنے آنسو پونچھ لیے، تکیے کو پیار سے سہلایا اور جب وہ اسے گدّے پر رکھنے لگی تو دو ننھی ننھی قمیصیں اور چار پوتڑے دیکھ کر اس کا جی ایک بار پھر تڑپ اٹھا، اس نے پوتڑے اور قمیصیں اٹھا کر کلیجے سے لگا لیں اور پھر اسی طرح کوٹھڑی سے باہر نکل کر اپنے کمرے کی طرف چل دی۔

تاجی جا چکی تھی، ہر طرف سنّاٹا تھا، کہیں سے اب سانس لینے کی آواز بھی نہیں آرہی تھی، ساجدہ نے قمیصیں اور پوتڑے کاغذ میں لپیٹ کر باسکٹ میں ڈال دیے۔ وہ خالہ بی کے کمرے کی طرف جا رہی تھی تو اس نے گیلری سے گزرتے ہوئے دیکھا کہ مالک اپنے کمرے میں زمین پر تنہا پڑے ہیں، باقی سب دروازے بند ہیں، اس نے سوچا کیا سب لوگ کمروں میں بند ہو کر تاجی کا سوگ منا رہے ہیں؟ وہ چپ چاپ باہر نکل گئی۔ مالی گھٹنوں پر سر رکھے جانے کیا سوچ رہا تھا، اس نے آواز دی تو وہ چونک پڑا۔

"مجھے تانگہ لا دو مالی! کیا تم تاجی کو رخصت کرنے نہیں گئے؟"

"چھوٹی بیگم صاحبہ کا آرڈر نہیں تھا ساجدہ بی بی!" وہ اُٹھ کر پھاٹک سے باہر نکل گیا، اور ساجدہ سوچنے لگی بھلا مالی کی کیا مجال جو بات کر سکے، کیا اُسے اپنی زندگی عزیز نہیں ہے خالہ بی!

وہ چند منٹ کھڑی سرسبز لان کو دیکھتی رہی، اسے وہ درخت خواہ مخواہ خزاں زدہ معلوم ہوا جہاں چاندنی راتوں میں اس نے تاجی اور کاظم کے سائے دیکھے تھے۔

وہ گھر پہنچی تو ناظم اسد اور احمد سے کھیل رہا تھا، وہ اُس وقت بے حد خوش نظر آرہا تھا مگر ساجدہ کو دیکھتے ہی جیسے اس کا سارا خون خشک ہو گیا۔

"کیا ہوا ساجدہ، کیا ——؟" اس نے ساجدہ کے دونوں شانے پکڑ لیے۔

"تاجی مرگئی ناظم!"

"کیا، کیسے مرگئی وہ؟" ناظم کی آواز بھرا رہی تھی۔

ساجدہ نے باسکٹ سے ننھی ننھی قمیصیں اور پونڑے نکال کر بستر پر پھیلا دیے، اور اسد کو اُٹھا کر سینے سے لگا لیا۔

"تاجی اتنی خاموشی سے مرگئی، اس نے کچھ کہا بھی نہیں، وہ کم از کم کاظم کو۔"

"پہلے وہ تمہارے بھائی سے محبت کرتی تھی۔" ساجدہ نے ناظم کی بات کاٹ دی "اور جب وہ اس ظالم سے بھاگنا چاہتی تھی، تو وہ ڈپٹی کمشنر تھا، سمجھ گئے۔"

ساجدہ نے اسد کو گود سے اتار دیا اور تاجی کے ہاتھ کے سلے ہوئے کپڑے تہہ کرنے لگی، اُس وقت اُسے جانے کیا ہو رہا تھا اُس کی نظروں سے ایسی نفرت اُبل رہی تھی کہ ناظم حیران رہ گیا۔

"میں کاظم کا بھائی ضرور ہوں مگر کاظم تو نہیں۔"

ساجدہ جیسے ایک دم ہوش میں آگئی۔ اس نے شرمندگی سے ناظم کی طرف دیکھا اور کپڑے اٹھا کر بکس میں رکھنے چلی گئی، ناظم اپنے لکھنے کا سامان سمیٹنے لگا۔

رات اتنی اداس اور ویران تھی کہ سوئے ہوئے بچّوں کے سانس لینے کی مدھم آوازیں بھی بین کرتی ہوئی معلوم ہو رہی تھیں، جیسے تیسے چند نوالے کھا کر اب وہ دونوں چپ چاپ لیٹے تھے۔ ساجدہ نے سوچا آج ناظم کے دوست بھی

جانے کہاں رہ گئے، کوئی تو آجاتا، کوئی تو ہنگامہ ہوتا، شاید ناظم بہل جاتا، آج اس نے پہلی بار اس کا دل دکھایا تھا، وہ کیا سوچ رہا ہوگا!

"ناظم!" ساجدہ نے اُسے آہستہ سے آواز دی

"سنو سجّو! میں انکار کرتا ہوں کہ کاظم میرا بھائی ہے۔"

کسی نے زور سے دروازہ کھٹکھٹایا تو ساجدہ ایک دم اُٹھ کھڑی ہوئی

"تم لیٹے رہو، میں دیکھتی ہوں۔"

دروازہ کھلتے ہی لالی جیسے دوڑتی ہوئی اندر آگئی۔ وہ پھوٹ پھوٹ کر رو رہی تھی، اس کا چہرہ انگارے کی طرح سُرخ ہو رہا تھا۔ ساجدہ سمجھ گئی کہ آج پھر چار مربعوں کے لالچ کے کوڑوں نے لالی کو زخمی کیا ہے، اس نے لالی کو لپٹا لیا اور کمرے میں لے آئی۔ ناظم اُٹھ کر دوسرے کمرے میں جانے لگا تو لالی جیسے چیخ پڑی "مت جائیں ناظم بھائی جان! اب تو میں اس گھر میں آگئی ہوں۔" ناظم اپنی جگہ پر حیران سا بیٹھا رہ گیا۔

"آج پھر اس نے مجھے مارا، اس نے مجھے باپ کی گالی دی، آج میں نے بھی اُسے مارا، آپ نے کہا تھا نا ساجدہ باجی! کہ تم بھی اُسے مارو۔" لالی بولے چلی جا رہی تھی "جب میں آ رہی تھی تو وہ میرے پیچھے بھاگا تھا مگر پھر رُک گیا، اب وہ مجھے مار ڈالے گا، میں جانتی ہوں یہ مربعوں والے کیسے ہوتے ہیں، کیسے۔"

وہ دوپٹے کے پلّو سے منہ چھپا کر سسکنے لگی۔

ایک لمحے کو سنّاٹا چھا گیا۔ ساجدہ نے ڈری ڈری نظروں سے ناظم کی طرف دیکھا مگر وہ تو اسے بڑے فخر سے دیکھ رہا تھا۔

"وہ تمہارا کچھ نہیں بگاڑ سکتے لالی! وہ اگر تمہیں مار ڈالیں گے تو ان کے مربعوں کا وارث کون ہوگا، وہ اپنے بیٹوں کو تو چھوڑ چکے ہیں۔" اس نے لالی کو تسلی دی مگر جی ہی جی میں ڈر رہی تھی کہ جانے کیا ہو گا۔ ان جاگیرداروں کے دماغ تھور زدہ زمین کی مانند ہوتے ہیں انہیں سینچ سینچ کر کون سرسبز کرے گا!

"لالی بہن! آپ نے کھانا کھایا ہے؟" ناظم نے آہستہ سے کہا

"کھانا ہمیشہ مربعوں کے ذکر سے شروع ہوتا ہے، پھر بھی میں نے کھایا تھا۔" رونے کے بعد وہ نہ جانے کیا سوچ رہی تھی۔

"تم فکر نہ کرو لالی! سب ٹھیک ہو جائے گا۔ انسان ہمیشہ بیچ میں تو نہ لٹکا رہے، اِدھر یا اُدھر، ٹھیک ہے نا؟" ساجدہ محبت سے لالی کا شانہ تھپکا رہی تھی" ہم دونوں یہاں سوئیں گے اور ناظم بیٹھک میں سو جائیں گے، ایں نا!"

ناظم اُٹھ کر جانے لگا تو دروازے پر ہلکی سی دستک ہوئی، لالی زور سے اچھل پڑی، ساجدہ کو اپنا دل ڈوبتا ہوا محسوس ہوا۔

ناظم نے دروازہ کھولا، تھوڑی دیر تک برآمدے سے باتوں کی آواز آتی رہی پھر ناظم زمیندار صاحب کو لیے کمرے میں داخل ہوا، وہ ہنس رہے تھے" دیکھیں ساجدہ بہن! یہ مجھے مار کر آپ کے پاس آگئی ہے، اب اس سے کہیں کہ گھر چلے، ایسا سناٹا ہو رہا ہے گھر میں!"

لالی جواب تک ساجدہ سے لپٹی ہوئی تھی، تیکھی تیکھی نظروں سے زمیندار صاحب کو دیکھنے لگی۔

"بھائی! یہ نہیں جائے گی۔" ساجدہ نے بڑے یقین سے کہا

"اب آپ سب غصّہ چھوڑ دیں، ناظم صاحب کچھ کم تھے کہ آپ بھی بہن ہو کر ناراض ہیں، دیکھیں نا، اگر وہ چار مربعے بھی ہوتے تو لالی کا آنے والا بیٹا اپنے علاقے کا سب سے بڑا زمیندار ہوتا، اِس کے باپ نے دھوکا کیا تھا نا! خیر اب وعدہ رہا آپ سے، میں اسے کبھی نہیں ماروں گا۔"

"جاؤ لالی!" ساجدہ نے لالی کا ہاتھ پکڑ کر اُٹھایا تو وہ یُوں زمیندار صاحب کے ساتھ لگ کر کھڑی ہو گئی جیسے کوئی بات ہی نہیں تھی، ہاں اس کے چہرے سے فتح کے نشان ظاہر ہو رہے تھے۔

جب دونوں چلے گئے تو ساجدہ دیر تک سوچتی رہی کہ کاش تاجی ایک بار تو لالی بن جاتی، سچ بول دیتی، یُوں ساری تہمتیں اٹھا کر تو نہ مرتی۔

"گلیاں ہوون سنجیاں تے وچ مرزا یار پھرے"

رضا نے اسکندر مرزا کی حکومت پر تبصرہ کیا اور سب اس طرح داد دینے لگے، جیسے انہوں نے اسکندر مرزا کو حجرہ شاہ مقیم میں بند کر دیا ہے۔ حسبِ معمول گرما گرم بحث شروع ہو گئی، مگر آج ساجدہ ان کی گفتگو سے اکتا رہی تھی۔ وہ سوچ رہی تھی کیا کرتے ہیں یہ لوگ، اپنی باتیں ضائع کر کے! دُوسروں کی باتیں دُہرا کر! یہاں لاؤزے کے اس مشورے پر کون عمل کرتا ہے کہ حکومت اس طرح پیار اور احتیاط سے کرو، جس طرح مُنی مُنی مچھلیاں پکائی جاتی ہیں۔ لاؤزے کی بات پر اس کے بادشاہ نے کب عمل کیا تھا! اس نے تو یُونہی لاؤزے کو یہ حکم سُنا دیا تھا کہ میری سلطنت چھوڑ کر بے شک چلے جاؤ مگر اپنا علم اور دانش یہاں چھوڑ جاؤ۔ کیا ضرورت تھی بادشاہ کو علم و دانش کی! اس کے پاس حکومت کرنے کےلیے بہت ہتھیار تھے، نوکر تھے اور ——— وہ اٹھ کر باورچی خانے میں چلی گئی، وہ صبح سے سوچ رہی تھی کہ مالک کے گھر میں سب کیسے ہوں گے، کتنا زمانہ گزر گیا، نہ کوئی آیا، نہ کوئی گیا، تاجی کی موت نے تو ناظم کو بھی اس گھر سے دُور کر دیا تھا، کبھی وہاں کی بات ہی نہیں کرتا تھا۔ بس اتنا معلوم ہوا تھا کہ کاظم کو ترقی مل گئی ہے

وہ اب کمشنر ہو گیا، حاکمِ اعلیٰ، حاکمِ وقت! ——— اور پھر وہ سوچنے لگی، جانے اس ملک کا کیا بنے گا جہاں بیوروکریسی کی حکومت ہو، جہاں جمہوریت نام کا تصوّر بھی سسکتا ہو، وہاں تو ہر طوفان آسکتا ہے، سب کچھ رشوت کا مال بن سکتا ہے۔ پھر وہ ایک دم جھلاّ سی گئی، ناظم نے اسے کیا سے کیا بنا دیا ہے۔ اب تو اسے کچھ اور سوچنے کی جیسے فرصت ہی نہیں رہ گئی، کہاں ہو گا صلاح الدین! وہ جو اس کا صلّو تھا، وہ کہاں کھو گیا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ آنسو پونچھ کر اس نے چائے دم کی، ٹرے میں پیالیاں رکھیں اور بیٹھک میں جا کر میز پر رکھ دی۔ وہ کھڑے ہو کر اجنبیوں کی طرح سب کو دیکھنے لگی۔

"بیٹھیے نا بھابی!" قاسم نے کہا

"کیا کروں بیٹھ کر۔" وہ بڑبڑائی "کیا ملے گا آپ لوگوں کو یوں کمروں میں بیٹھ کر باتیں کرنے سے!" ساجدہ نے سب کی طرف دیکھا "ہمّت کیجئے، نکلیے گلی کوچوں میں، لوگوں کو زبان دیجئے، لوگوں کو ان کی محرومی کا احساس دلائیے۔ بچّہ روتا نہیں تو ماں کو بھی اس کی بھوک کا احساس نہیں ہوتا اور ———" وہ سب کو حیران چھوڑ کر تیزی سے مڑی اور اپنے بستر پر گر سی پڑی۔ شاید اس نے یہ غلط حرکت کی ہے ——— شاید ——— پتہ نہیں ناظم کیا سمجھے گا!

چھٹی کا دن تھا، وہ بچوں کو ناظم کے پاس چھوڑ کر مالک کے گھر چلی گئی۔ جب وہ تانگے سے اُتری تو جھجک کر رک گئی۔ دو چمچاتی ہوئی کاریں اس کا منہ چڑا رہی تھیں۔ باوردی ڈرائیور اور اجنبی نوکر اسے تنقیدی نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ اگر پرانا مالی آکر سلام نہ کرتا تو شاید وہ واپس چلی جاتی۔

"بہت دن بعد آئیں ساجدہ بی بی! آپ کاظم میاں کی شادی میں بھی نہیں آئیں۔ چھوٹی بیگم اتنے دنوں سے بہت بیمار رہیں، بہت بیمار ہیں، آپ انہیں بھی دیکھنے نہیں آئیں۔" مالی اس کے ساتھ ساتھ چلتا ہوا کہہ رہا تھا، اس نے دروازہ کھولا اور اندر داخل ہو گئی۔ گیلری کی سج دھج دیکھ کر اُسے یوں لگا جیسے وہ کسی اور گھر میں آگئی ہے، ڈرائنگ روم سے باتیں کرنے اور ہنسنے کی آوازیں آرہی تھیں، وہ آہستہ سے خالہ بی کے کمرے میں داخل ہو گئی۔ وہ اس طرح غنودگی میں پڑی تھیں جیسے انہیں سونے کی دوا دی گئی ہو۔ اُن کا چہرہ اگر چادر سے باہر نہ ہوتا تو وہ سمجھتی کہ کوئی لاغر بچہ پڑا ہے —— "خالہ بی، خالہ بی!" اس نے آہستہ سے پکارا تو انہوں نے آنکھیں کھول دیں۔

"ساجدہ، سجو بیٹی —— !" ان کی آنکھوں سے دو آنسو لڑھک کر تکیے

میں جذب ہو گئے۔

"مجھے کسی نے نہیں بتایا خالہ بی! کہ آپ بیمار ہیں"۔ ساجدہ ان کا کمزور ہاتھ تھام کر سہلانے لگی۔

"کاظم کی شادی ہوگئی ہے، اس نے تم لوگوں کو نہیں بلانے دیا، تمہاری امّاں بی بھی شادی میں شریک نہیں ہوئیں، تاجی کی موت کے بعد انہوں نے باہر نکلنا چھوڑ دیا ہے، ہر وقت اپنے کمرے میں بند رہتی ہیں، مجھے تو اب یہ لگتا ہے کہ میں بہت مجرم ہوں"۔ وہ اٹک اٹک کر بولے جا رہی تھیں "سلیمہ بھی نہیں آتی، اب صرف چھٹّی میں آتی ہے، میرے پاس چند منٹ بیٹھتی ہے اور چلی جاتی ہے اور تمہارے مالک ہر وقت شراب کے نشے میں دھت رہتے ہیں، انہیں دنیا کا ہوش نہیں ہے، مجھے دیکھنے آتے ہیں تو زمین پر گر پڑتے ہیں میں اب انہیں اُٹھا بھی نہیں سکتی یُوں ہی پڑے رہتے ہیں، کوئی اٹھانے والا نہیں ہے"۔ ان کی آنکھوں سے آنسو ٹپ ٹپ گرنے لگے۔

ساجدہ کا کلیجہ مسل رہا تھا، وہ کسے مجرم کہے اور کسے بے گناہ! ڈرائنگ روم میں قہقہے لگنے کی آواز آئی تو ساجدہ کا جی چاہا کہ جا کر سب کا منہ نوچ لے "سب ہنس رہے ہیں، سب اپنی اپنی دنیا میں مگن ہیں، اور یہ زندہ لاش تنہا پڑی اونگھ رہی ہے اور سلیمہ ——" اس نے بڑی بوڑھیوں کی طرح سوچا "کیا مائیں اسی دن کے لیے اولاد کو جنم دیتی ہیں؟ کیا سلیمہ اتنی کٹھور ہے، وہ یہاں کیوں نہیں ہے، وہ اپنی ماں کے سرہانے بیٹھی ہوئی کیوں نظر نہیں آتی؟

"خالہ بی! آپ بہت جلد اچھی ہو جائیں گی، آپ کے بغیر یہ گھر کیسے چل سکتا ہے؟"

"میں بہت تھک گئی ہوں، بہت تھک گئی ہوں۔" انہوں نے جیسے بڑی دقّت سے ایک لمبی آہ بھری۔

آپ کبھی نہیں تھک سکتیں خالہ بی! آپ ——" وہ نفسیات پر پڑھی ہوئی کتابوں کا سہارا لینا چاہتی تھی، خالہ بی اُسے عجیب سی نظروں سے دیکھ کر مسکرائیں۔

"جاؤ سلیمہ کے کمرے میں جاؤ، وہ آکر اپنے کمرے میں چھپ جاتی ہے۔" انہوں نے کیا کچھ سوچتے ہوتے کہا "کیا پتہ آگئی ہو —— کاظم اور اس کی دلہن دونوں اس کا بڑا خیال رکھتے ہیں مگر کیا مجال ہے جو وُہ کسی سے کھل کر بات بھی کرے لیکن ہاں بچّے کیسے ہیں؟ ناظم کیسا ہے؟"

خالہ بی اس کے جواب کا انتظار کیے بغیر اونگھ گئیں۔

وہ اُٹھ کر سلیمہ کے کمرے میں چلی گئی، اُسے یہ دیکھ کر سخت حیرت ہوئی کہ سلیمہ اپنے بستر پر اس طرح آنکھیں بند کیے لیٹی تھی جیسے سو رہی ہو، اس کا گول بھرا بھرا چہرہ دُبلاپے کی زد میں تھا اور دُودھیا رنگ پر زردی چھائی ہوئی تھی۔

"اُفوہ، ساجدہ بی بی! تم کیسے آگئیں آج؟" اُس نے آنکھیں کھول دیں اور ساجدہ کو تکتی ہوئی نظروں سے دیکھنے لگی۔

"اُسی طرح جیسے آپ آئیں اور کسی کو پتہ بھی نہیں چلا۔"

"میں تو بہت دنوں سے اسی طرح آتی ہوں ساجدہ بی بی!" وہ اُٹھ کر بیٹھ گئی۔

"سلیمہ باجی! کیا ہوگیا ہے آپ کو، کیا آپ کو معلوم نہیں کہ خالہ بی سخت بیمار ہیں، وہ آپ کے لیے تڑپتی رہتی ہیں، اور ایک آپ ہیں جو انہیں بس شکل

دکھا کے غائب ہو جاتی ہیں، وہ آپ کی ماں ہیں، ماں ـــــ" ساجدہ کی آواز بھرا گئی۔

سلیمہ کا چہرہ ایک دم سُرخ ہو گیا، اُس کی آنکھوں میں اتنی سختی اتر آئی کہ ساجدہ کے لیے اس سے نظریں ملانا مشکل ہو گیا۔

"ساجدہ بی بی!" اس نے تھرتھراتی آواز میں کہا "میں نے کبھی تم سے تمہاری زندگی کا حساب مانگا ہے، جو آج تم مجھے الزام دینے آئی ہو، مجھ سے جواب طلب کر رہی ہو۔" وُہ تھوڑی دیر کے لیے رُکی جیسے خاموش رہنے کی کوشش کر رہی ہو۔ "سُننا نہیں چاہتی ہو تو سُنو! کیا تمہیں معلوم نہیں کہ ماں کے ساتھ ایک باپ بھی ہوتا ہے، کہاں ہے میرا باپ؟ مر گیا تھا نا، اچھّا ہوا، ورنہ وُہ بھی اُسی آگ میں جلتا رہتا، جس میں امّاں بی سُلگ رہی ہیں، میں جل رہی ہوں، سب کچھ جل رہا ہے!"

"آپ یہ باتیں اپنی ماں کے بارے میں کر رہی ہیں سلیمہ باجی؟" اس نے گھبرا کر پُوچھا۔

"نہیں، ساجدہ بی بی! نہیں، میں تو ایک ایسی عورت کی بات کر رہی ہوں جس نے ایک سہاگن کو بیوہ بنا رکھا ہے اور بے چاری یہ بھی نہیں جانتی کہ اس نے تو ایک خادمہ، ایک آیا بن کر زندگی گزار دی ہے۔ اس نے اپنی بیٹی کو گود سے اتار کر دوسروں کے بیٹے کو اپنی آنکھوں پر بٹھایا، جانتی ہو کیوں؟ اس لیے کہ وُہ اپنی محبت ثابت کرے، میں بھی عورت ہُوں ساجدہ بی بی! مگر میں اپنی ماں جیسی نہیں بننا چاہتی، میں کسی کی محبت نہیں چھین سکتی، میں کسی کو محبت کرنے کے حق سے محروم نہیں کر سکتی، ایسی محبت سے تو نفرت ہی بہتر ہے۔" ساجدہ نے چونک کر اس کی

طرف دیکھا مگر وہ ایک ہی رَو میں بولے چلی جارہی تھی "میں جانتی ہوں ساجدہ بی بی! نفرت دنیا کا بدترین بوجھ ہے، اس کے نیچے دب کر انسان کچھ بھی نہیں رہ جاتا، پھر بھی میری محبتوں پر نفرت غالب ہے، میں اپنی ماں سے نفرت کرتی ہوں، اپنی سگی ماں سے!"

سلیمہ چھت کو اس طرح گھورے جارہی تھی جیسے سب کچھ اس پر لکھا ہے "میں کبھی سوچتی ہوں کاش یہاں بھی تمہارے باپ جیسا کوئی ہوتا، حساب تو سیدھا رکھتا، یہاں تو سب ڈنڈی مار رہے ہیں، کوئی کسی کا نہیں ہے، عجیب نفسا نفسی ہے، سب ایڑیاں رگڑ رگڑ کر اپنی اپنی قبروں کی طرف گھسٹتے چلے جارہے ہیں، اپنا اپنا حساب دینے! بس ایک کاظم ہے جو ہر حساب سے بے نیاز ہے، اللہ میاں کے حساب سے بھی!"

ساجدہ کا سر چکرانے لگا تھا، اس کے دل میں کبھی غصّے کی لہر اُبھرتی اور کبھی رحم کی، اس کے ذہن سے جیسے سارے الفاظ مِٹ گئے تھے۔ وہ بولنے کی کوشش کرتی تھی مگر بول نہیں سکتی تھی، وہ ابھی اسی کشش و پنج میں تھی کہ سلیمہ پر کھانسی کا شدید دورہ پڑا۔ اس کی آنکھیں پھٹ کر دگنی ہوگئیں۔ اس نے تکیے کے نیچے سے رومال گھسیٹا اور اُسے منہ پر رکھ کر کھانسی کی آواز دبانا چاہی مگر پھُولی ہوئی سانس منہ بند کر دینے سے تو نہیں سنبھل سکتی، وُہ بھاگ کر غسل خانے میں چلی گئی، وہاں بھی وہ بے طرح کھانس رہی تھی، تھوڑی دیر بعد ساجدہ کو ایسے لگا، جیسے سلیمہ سسکیوں سے رو رہی ہے، وُہ دروازہ کھول کر اندر چلی گئی۔ واش بیسن میں تازہ تازہ خُون چمک رہا تھا اور سلیمہ بڑے اطمینان سے کھڑی اسے پانی کے چھینٹے مار مار کر

بہا رہی تھی۔

"سلیمہ باجی! یہ کیا ہے؟" وہ خون دیکھ کر وحشت زدہ ہو گئی تھی۔

"کچھ نہیں، کم بخت نکسیر کو بھی اسی وقت پھُوٹنا تھا۔"

ساجدہ نے بڑھ کر اس کا ہاتھ پکڑا تو وہ آگ کی طرح تپ رہا تھا "سلیمہ باجی! آپ کو تو بخار ہے، آپ تو بہت بیمار ہیں، آپ ڈاکٹر کے پاس چلیں۔"

"ڈاکٹر کے پاس! کیوں' مجھے کیا ہے، میں خود ہی ٹھیک ہو جاؤں گی، بڑی سخت جان ہُوں' بڑی ڈھیٹ ہُوں، تم میری فکر نہ کرو، ذرا دُور ہٹ کے کھڑی ہو' تمہارے چھوٹے چھوٹے بچّے ہیں اور تمہیں ناظم کا بھی خیال رکھنا ہے، اس بیچارے نے تو ملک کا حساب رکھتے رکھتے اپنی صحت بھی گنوا دی ہے، اِدھر کاظم کو دیکھو کیسا سُرخ انار ہو رہا ہے۔"

سلیمہ نے پلنگ پر لیٹ کر آنکھیں بند کر لیں، اس کا رنگ زرد پڑ گیا، اور اُس کی آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے گہرے ہو گئے، ساجدہ تھوڑی دیر خاموش کھڑی اُسے دیکھتی رہی، پھر اس کا دم گھُٹنے لگا' اُسے تازہ ہوا چاہیے تھی۔ وُہ دبے پاؤں باہر نکل کر گیلری میں آ گئی وہیں کھڑے کھڑے اُسے یُوں لگا جیسے اُسے کھانے کے کمرے میں بلایا جا رہا ہے، وہ کچھ سوچے بغیر اس طرف چل دی۔ کھانے کے کمرے میں ایک سرے سے دُوسرے سرے تک قالین بچھا تھا۔ قالین کے ہلکے رنگ سے ملتے ہُوئے ویلوٹ کے پردے لٹک رہے تھے، درمیان میں بڑی سی خوبصورت میز چمک رہی تھی، اس کے ارد گرد منقش کرسیاں بچھی تھیں جن کی گدّیوں کا رنگ قالین کے شوخ رنگ سے لیا گیا تھا، ایک طرف شیشے کی

دو الماریوں میں چینی اور چاندی کے برتن اس قرینے سے سجائے گئے تھے کہ صاف گنے جا سکتے تھے، سب کچھ نیا تھا، کوئی چیز بھی جانی پہچانی نہیں تھی۔ دیواروں نے بھی رنگ بدل لیا تھا، وہ ڈائننگ رُوم کی دہلیز پھلانگنے کی ہمت نہ کر سکی، وہیں کھڑے کھڑے سوچتی رہی "سارا گھر تو ڈھنڈار پڑا ہے ایسا لگتا ہے کہ وہاں بھوت رہتے ہیں اور یہ کمرہ دُلھن کی طرح سجا ہے، ڈرائنگ روم تو اس سے بھی زیادہ خوب صورت ہوگا اور کاظم اور اس کی دُلھن کا بیڈ رُوم تو اور بھی حسین ہوگا۔

ساجدہ کو رات بھر چین نہ پڑا، کبھی سلیمہ کی زرد صورت سامنے آجاتی اور کبھی خالہ بی کی ہڈیوں کا ڈھانچہ۔ کبھی مالک پانی مانگتے سنائی دیتے تو کبھی کاظم قہقہے لگاتا ہوا! سلیمہ کی باتیں یاد آتیں تو وہ اُٹھ کر بیٹھ جاتی اور حیران ہو کر سوچتی کہ کیا سچ اتنا کڑوا بھی ہوتا ہے! اگر کھانسی کا دورہ نہ پڑتا تو وہ پتہ نہیں اور کیا کچھ کہہ دیتیں! ان کے اندر کب سے یہ لاوا پک رہا تھا! وہ اگر نہ چھیڑتی تو کیا ان کا سینہ کبھی نہ پھٹتا؟ کیا ان کی آتش فشاں زبان کبھی نہ کھلتی؟ کیا خبر خالہ بی نے صرف سلیمہ کی خاطر ہی سارا ایثار کیا ہو! تنہا عورت ایک بچّی کو کیسے پالتی؟ اس کی حفاظت کیسے کرتی؟ خالہ بی اگر چاہتیں تو کیا مالک سے دو بول نہیں پڑھا سکتی تھیں! مگر انہوں نے نہیں پڑھائے۔ پھر مالک کی بے بسی کا ذکر کرتے ہوئے ان کی آنکھوں میں آنسو کیوں بھر جاتے ہیں۔ انہوں نے کاظم کی خاطر تاجی کی موت کو جھوٹ کی چادر میں لپیٹنے کا گناہ اپنے سر کیوں لیا تھا؟

وہ اپنی سوچ سے خود ہی گھبرا گئی۔ اس نے سر جھٹک کر خیال بدلنا چاہا، مگر خیالات کی تو اپنی خود کار قوت ہوتی ہے، وہ آسمانوں سے بھی اُوپر اُٹھ جاتے ہیں اور زمین کی پاتال تک بھی پہنچ جاتے ہیں ان کی راہ کوئی نہیں

روک سکتا۔ ساجدہ کے خیالات مالک کے گھر میں ہی گھوم رہے تھے۔ اس نے سوچا بڑا دل تو امّاں بی کا ہے کہ سب کچھ جانتی ہیں اور چپ چاپ سہتی چلی آ رہی ہیں، لیکن میں سلیمہ کی باتوں پر کیوں حیران ہوئی! میں نے بھی جب سے اُس گھر میں قدم رکھا ہے یہی کچھ دیکھ رہی ہوں، کیا حقیقت بھی اظہار کی محتاج ہوتی ہے، کیا مجھے گھر میں رہنے والوں کے رشتوں کا احساس دلانے کے لیے سلیمہ باجی کا پھٹ پڑنا ضروری تھا! ہم لوگ کیا عجوبہ ہیں! یہ کیسی جگہ ہے جہاں بیٹی ماں سے اور بیوی شوہر سے نفرت کرنے لگتی ہے! یہ کیا ہے، جسے، سب سے زیادہ ظلم ڈھانے اور لوٹ مار کرنے کا موقع مل جاتا ہے، وہی سب سے بڑا اور عزت دار بن جاتا ہے! ہم سب لوگ کس مقصد کے لیے پیدا ہوئے ہیں! ہم حق اور سچ کا سامنا کیوں نہیں کر سکتے! ہم اتنے کمزور ہیں کہ اپنے جیسے انسانوں سے خوفزدہ رہتے ہیں، ان کے سامنے جھک جاتے ہیں، ان سے نظریں ملانے سے کتراتے ہیں، ان سے اپنا حق مانگتے ہوئے ڈرتے ہیں! اس کے ذہن میں سوالات ٹڈی دَل کی طرح بڑھتے ہی چلے جا رہے تھے۔ وہ بستر سے اٹھ کر زمین پر ننگے پاؤں ٹہلنے لگی۔

مالک کا گھر اب کمشنر کاظم کی کوٹھی سہی مگر اُس گھر کی کچھ ذمہ داری بھی تو کاظم پر ہے، وہی تو فساد کی جڑ ہے، اس کی وجہ سے گھر کا شیرازہ بکھرا ہے، اسے امّاں بی اور ناظم کی پروا نہیں ہے تو نہ سہی، خالہ بی اور سلیمہ کا تو کچھ حق ہے اس پر، ان کا تو باقاعدہ علاج کرائے، مالک کی دیکھ بھال کے لیے ایک ملازم ہی مقرر کر دے۔ وہ کل شام جائے گی اور کاظم سے صاف صاف بات کرے گی اس نے اگر بُرا مانا تو مانتا رہے وہ اس کی کون سی پروا کرتی ہے۔

اس خیال نے اسے تھوڑا سا سکون دیا اور وہ بستر پر لیٹتے ہی سو گئی۔

کاظم نے گھر کے باہر والے کمرے میں دفتر بنایا ہوا تھا۔ وہ شام کو اس میں بیٹھتا اور لوگوں سے ملاقاتیں کرتا، کمرے کے سامنے چھوٹا سا باغیچہ تھا، اب اس میں بھی سلیقہ آگیا تھا، باغیچے میں دس بارہ کرسیاں رکھی رہتی تھیں، ان پر بیٹھ کر ملاقاتی کمشنر کے بلاوے کا انتظار کرتے تھے، کمرے کے دروازے پر وہی چپراسی پہرا دیتا تھا جو کاظم کی عدالت میں سائلوں کے نام پکارتا تھا۔ وہ کاظم کا خاص ملازم تھا، سب جانتے تھے کہ وہ چاہے تو کسی کو بھی چند منٹ میں کمشنر صاحب کے سامنے پیش کرسکتا ہے۔

ساجدہ دفتر والے کمرے کے قریب سے گزری تو ملاقاتیوں میں اسے ایک جانی پہچانی سی صورت نظر آئی، اس نے رک کر غور سے دیکھا اور سرگوشی کے انداز میں کہا "صلّو! تم کہاں؟" وہ تھر تھر کانپنے لگی۔ اس شخص نے بھی دوسرے ملاقاتیوں کی طرح گھوم کر اس پر ایک نظر ڈالی اور پھر پاس بیٹھے ہوئے شخص سے باتیں کرنے لگا۔

"نہیں، میری آنکھوں نے دھوکا کھایا ہے، شارک سکن کی شیروانی میں بندھا ہوا یہ شخص صلّو نہیں ہوسکتا، وہ تو دُبلا پتلا اور خوبصورت ہے۔ اگر صلّو ہوتا تو وہ بھاگ کر

اس کے پاس آجاتا اور وہ سب کچھ بھول کر اس سے لپٹ جاتی۔ یہ تو کوئی اور آدمی ہے مگر اس کی شکل صلّو سے کتنی ملتی ہے!" وہ بڑبڑاتے ہوئے مڑی اور گھر کے اندر جانے لگی تو مالی نے بڑھ کر سلام کیا، وہ اس کی خیریت معلوم کرنے کو رُکی تو وہ شخص اُٹھ کر اس کی طرف لپکا "ارے ساجدہ! تم ہو؟ یہاں کیا کر رہی ہو؟"

ساجدہ کا جی چاہا کہ بھاگ کر اس کے گلے لگ جائے، خوب روئے اور اُسے اپنے دُکھ سنائے، اُس سے پُوچھے کہ وہ کہاں غائب ہو گیا تھا! وہ کس کس طرح اس کا انتظار کرتی رہی! کبھی ایک لمحے کو بھی اُسے نہ بھول سکی، مگر وہ شخص تو درمیان میں فاصلے کی دیوار چُن کر کھڑا تھا، ساجدہ کو سامنے دیکھ کر اسے ذرا سی بھی خوشی نہیں ہوئی تھی، وہ تو بس ایک سوالیہ نشان تھا، ایک خشک کُنواں تھا۔

"ساجدہ! تم کیسی ہو؟" وُہ اپنی غلطی کی اصلاح کر کے جھینپ گیا۔ اُسے یہ سوال پہلے کرنا چاہیے تھا مگر اس کا لہجہ پھر بھی خشک رہا۔

وہ اس صلّو سے کتنا مختلف تھا جسے ساجدہ ہر رات خواب میں دیکھتی تھی اور ہر خواب میں وہ وعدہ کرتا تھا کہ ایک نہ ایک دن اُسے ڈھونڈ لے گا، اسے یقین تھا کہ یہ خواب سچّا ہے مگر صلّو نے خواب کا وعدہ پُورا کرنے میں کتنے سال بِتا دیے تھے۔ اُس نے پھر وہ چہرہ غور سے دیکھا، جسے ایک نظر دیکھنے کو وہ کب سے ترس رہی تھی، مگر اس پر تو دور دور تک محبّت کا کوئی نشان نہیں تھا۔ ساجدہ نے اپنے حواس پر قابو پا یا۔ زندگی نے اسے یہ فن سکھا دیا تھا۔ اس نے آہستہ سے جواب دیا "ٹھیک ہوں، مگر تم یہاں کیسے؟"

"میں کمشنر صاحب سے ملنے آیا ہُوں، مگر تم یہاں کیا کر رہی ہو؟"

"میں۔" اب اس کی آواز کا رعشہ بھی دُور ہو گیا تھا "یہ میری ساس کا گھر ہے، اور کاظم ——— وہ میرے شوہر کا چھوٹا بھائی ہے۔" اس نے ایک کنکر کنویں میں پھینکا کہ شاید اس کی تہہ میں کچھ پانی ہو، اُسے یہ سُن کر دُکھ ہو کہ وہ کسی اور کی ہو چکی ہے۔

مگر اس کے چہرے پر تو اب حیرت کے ساتھ مرعوبیت بھی تھی۔

"تو تم کمشنر صاحب کی بھاوج ہو!" یہ جملہ خنجر کی طرح ساجدہ کے دل میں اتر گیا "یہ بھی خوب رہی میں تو کمشنر صاحب کے لیے بڑے دُور سے سفارش ڈھونڈھ کر لایا ہُوں، واہ یہ تو اپنے گھر کی بات ہے۔" اس کا چہرہ آہستہ آہستہ کھِل رہا تھا "مجھے یہاں ایک کوٹھی الاٹ کرانا ہے، کمشنر صاحب مہربانی کر دیں تو میرا کام ہو سکتا ہے۔" اس نے اپنی عرضی ساجدہ کے سامنے پیش کر دی، مگر وہ تو اس نازک سی بیل کو گھورے جا رہی تھی جس نے کمشنر کے دفتر کی ایک دیوار کو اپنے چھوٹے چھوٹے پتّوں میں چھپا لیا تھا۔

"تم آج کل کہاں پڑھاتے ہو؟" وہ جیسے خواب والے صلّو سے مخاطب تھی

"میں سرگودھا میں رہتا ہُوں۔" اس نے شاید ساجدہ کا پُورا جملہ نہیں سُنا تھا "وہاں میری بہت سی زمین ہے، دس مربعوں میں تو صرف باغ ہے، بڑے اچھے مالٹے ہیں میرے باغ کے، خالص رُیڈ بلڈ۔ میری بیوی کو بھی جہیز میں پچیس مربعے ملے ہیں، ہم دونوں اپنے علاقے کے سب سے بڑے زمیندار ہیں۔ سارے افسر ہمارے ہاں آ کر ٹھہرتے ہیں۔"

ساجدہ حیران ہو کر سوچ رہی تھی کہ صلّو کی باتیں ہی نہیں، بات کرنے کا انداز بھی بدل گیا ہے۔ اپنی زمین کا رقبہ گناتے وقت اس کی ٹھوڑی فخر سے اُوپر

اٹھتی جا رہی ہے اور سینہ پھولتا جا رہا ہے۔ فتوحات کی فہرست ابھی مکمل نہیں ہوئی تھی "میرے دو بیٹے چیفس کالج میں پڑھتے ہیں ان کے لیے دو ملازم رکھ چھوڑے ہیں پھر بھی آنا جانا لگا رہتا ہے۔ اگلی دفعہ آؤں گا تو اپنی بیوی کو بھی ساتھ لاؤں گا تم سے ملانے۔"

ساجدہ کو اتنی مہلت ہی نہ ملی کہ وہ صلّو کے دل میں سے کوئی پرانی یاد کھرچ کر نکالتی، وہ تو اسے یہ بھی نہ بتا سکی کہ وہ اس بنگلے میں نہیں رہتی، وہ ابھی کچھ سوچ ہی رہی تھی کہ چودھری صلاح الدین نے کمشنر کو کمرے سے نکلتے دیکھا۔ وہ ساجدہ کو بھول کر اس کی طرف بھاگا، وہ کاظم کو اس طرح جھک جھک کے سلام کر رہا تھا جیسے اس کے قدم چھو لے گا، پھر وہ دوسرے ملاقاتیوں میں گم ہو گیا جو کاظم کے گرد گھیرا ڈالے کھڑے تھے۔ ساجدہ کے دل میں کانٹے سے چبھنے لگے، اُسے یوں لگا جیسے کفن میں لپٹی ہوئی ایک لاش اس کے پاس آئی اور واپس چلی گئی۔ وُہ خوف زدہ سی ہو کر کوٹھی سے باہر نکل گئی۔

گیٹ کے قریب اسے ایک بوڑھی آواز سُنائی دی "میری بیٹی! میری بیٹی کہاں ہے؟"

اس نے دہشت زدہ ہو کر اِدھر اُدھر دیکھا وہاں تو کوئی بھی نہیں تھا، صرف درختوں کے پتّے سرسرا رہے تھے، اس کی ٹانگیں بُری طرح کپکپانے لگیں، وہ دیوار سے لگ کر بیٹھ گئی اور پھُوٹ پھُوٹ کر رونے لگی۔ اس کی آنکھ سے گرتے ہوئے آنسو زمین اپنے سینے میں جذب کرتی جا رہی تھی۔

گھر جاتے ہوئے اسے تانگے کی رفتار بہت سست لگ رہی تھی اس نے

کوچوان سے کہا "بھائی! ذرا تیز نہیں چل سکتے!"

کوچوان نے گھوڑے کو چابک دکھائی تو اس کے سموں تلے لگے ہوئے نعل پکی سڑک پر چنگاریاں اڑانے لگے۔ وہ آنسو پونچھ کر سوچ رہی تھی "پتہ نہیں ناظم اس وقت کیا کر رہا ہوگا!"

خدیجہ
مستور

